باب سوم

اسلام اکیسویں صدی میں

اکیسویں صدی غالباً تہذیبی ارتقا کا نقطۂ انتہا (culmination) ہے۔ انسانی تہذیب مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اب غالباً اپنے آخری مرحلے میں پہنچ چکی ہے۔ بظاہر حالات اب تہذیب کے سفر کا کوئی مزید مرحلہ باقی نہیں۔

پیغمبرانہ مشن میں ارتقا (evolution) کا کوئی تصور نہیں۔ پیغمبرانہ مشن اپنی آئڈیالوجی کے اعتبار سے، ہمیشہ ایک ہی تھا اور آخر تک ایک ہی رہے گا، البتہ دعوتی طریقِ کار کے اعتبار سے، وہ ایک ارتقا پذیر واقعہ ہے۔ نئے حالات ہمیشہ نئے مواقع پیدا کرتے ہیں اور داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اِن نئے مواقع کو دریافت کرے اور اُن کو بھر پور طور پر دعوت الی اللہ کے کام میں استعمال کرے۔

اسلام کی تکمیل کے دو پہلو

اسلام کی تکمیل کے دو پہلو ہیں — ایک، وہ جس کو قرآن میں دین کی تکمیل (5:3) کہا گیا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں ''تکمیل'' سے مراد احکامِ دین کی فہرست کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اُس سے یہ مراد ہے کہ کوئی ارتقائی ترتیب ہے اور 10 ہجری میں یہ ارتقائی ترتیب مکمل ہوگئی۔ اِس سے مراد صرف آیاتِ قرآنی کے نزول کی تکمیل ہے۔ اِس سے مراد عملاً وہی چیز ہے جس کو قرآن کی دوسری سورہ میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔

تکمیل کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق دین کی تکمیل سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق دعوت کی اشاعت اور توسیع سے ہے۔ اِس دوسرے پہلو کا ذکر قرآن میں اشارةً آیا ہے۔ یہ اشارہ قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (6:19) یعنی پوچھو کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے۔ کہو، اللہ۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے۔ اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تا کہ میں تم کو اس سے خبردار کردوں اور وہ بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اِس قرآن کے ذریعے سے اپنے معاصرین کو آگاہ کرے اور بعد کے زمانے میں پیغمبر کے ماننے والے اگلی نسلوں کو ہر دور میں اُس سے آگاہ کرتے رہیں۔ دعوت کا یہ عمل مسلسل طور پر قیامت تک جاری رہے گا۔ دعوت الی اللہ کی اِس عالمی تکمیل کا ذکر ایک حدیثِ رسول (لا یبقی علی ظہر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله کلمة الإسلام) میں زیادہ واضح طور پر آیا ہے۔۔ دعوت الی اللہ کی عالمی اشاعت کے لیے عالمی ذرائع مواصلات درکار تھے، جو کہ ساتویں صدی عیسوی میں قابلِ حصول نہ تھے۔ اِس لیے دعوت الی اللہ کی تکمیل کو مستقبل میں پیش آنے والے واقعے کی حیثیت سے بطور پیشین گوئی (prediction) بیان کیا گیا ہے۔

دورِ آخر کے دُعاۃ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اِن الفاظ میں آئی ہے: عباد لیسوا بأنبیاء ولا شهداء یغبطهم النبیون والشهداء لمقعدهم وقربهم من الله یوم القیامة (مسند احمد: 5/341) یعنی اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو نہ پیغمبر ہوں گے اور نہ شہید، مگر قیامت کے دن انبیا اور شہدا بھی اُن پر رشک کریں گے، اللہ سے اُن کے قرب کی بنا پر۔

اِس حدیثِ رسول میں غبطہ (envy) کا لفظ اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے، یعنی اس کا مقصد مذکورہ افراد کی پراسرار فضیلت بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ دراصل تحیر خیز پسندیدگی (wondrous appreciation) کے معنی میں ہے، یعنی وہ لوگ اگرچہ پیغمبر کے امتی ہوں گے، لیکن پیغمبر کی ہدایت کا اتباع کرتے ہوئے اُن کے ذریعے کچھ ایسے کام انجام پائیں گے جو پچھلی پوری تاریخِ نبوت میں انجام نہیں پایا تھا۔

یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں، غور کرکے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دینِ خداوندی میں جو چیز مطلوب ہیں، وہ بہ تمام وکمال وجود میں آچکی ہیں — وحی الٰہی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایت کا پوری طرح محفوظ ہوجانا، پیغمبر کی صورت میں انسان کی زندگی کا ایک رول ماڈل (role model) تیار ہوجانا، دینِ خداوندی کی تاریخ کا ایک مستند ریکارڈ وجود میں آجانا، مذہبی جبر کا ہمیشہ کے لیے ختم

ہوجانا، دورِ بادشاہت میں ہر چیز پر جو شخصی کنٹرول قائم تھا، اس کا ختم ہوکر دورِ جمہوریت آجانا، جب کہ انسانی سرگرمیوں کے تمام مواقع پوری طرح کھل گیے، وغیرہ۔ پیغمبرانہ مشن کے تحت یہ تمام چیزیں مطلوب تھیں جو کہ مکمل طور پر حاصل ہوگئیں۔

مگر ایک مطلوب ایسا تھا جو پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کی تاریخ کے دوران پوری طرح حاصل نہیں ہوا تھا، اور وہ ہے دعوتِ خداوندی کی عالمی اشاعت۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اِس لیے بھیجی ہے، تا کہ وہ تمام اہلِ عالم تک پہنچے اور تمام لوگوں کے لیے آگاہی کا ذریعہ بنے (25:1)۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبرانہ تاریخ کے دور میں یہ عالمی مطلوب پوری طرح واقعہ نہ بن سکا۔ اِس کا فطری سبب یہ تھا کہ دین کی عالمی اشاعت کے لیے عالمی مواصلات کی ضرورت ہے، اور عالمی مواصلات کے یہ ذرائع پچھلے زمانے میں موجود ہی نہ تھے۔

اِس پہلو سے غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مذکورہ حدیثِ رسول میں جن خوش قسمت لوگوں کا ذکر ہے، وہ سچے اہلِ ایمان کی وہ جماعت ہے جو دورِ مواصلات میں دینِ خداوندی کے اِس دعوتی نشانے کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچائے گی کہ اُس سے روئے زمین پر بسنے والے تمام مرد اور عورت باخبر ہوجائیں۔ قیامت میں کوئی فرد یا گروہ ایسا نہ رہے کہ جو جائز طور پر یہ کہہ سکے کہ: إنا کنا عن ھذا غافلین (7:172)۔ تاریخ انسانی کے دورِ آخر میں اللہ کی توفیق سے جو اہلِ ایمان اِس دعوتی نشانے کو پورا کریں گے، وہی غالباً وہ لوگ ہیں جن کا ذکر مذکورہ حدیثِ رسول میں کیا گیا ہے۔

ٹیم اسپرٹ

وہ گروہ جس کو آخرت میں قربِ خداوندی کی نسبت سے اتنا بڑا درجہ ملے گا کہ انبیا اور شہدا بھی اُن پر رشک کریں گے، ان کی وہ صفتِ خاص کیا ہوگی جو اُن کو قربت کے اِس مقام تک پہنچائے گی۔ اِس صفت کا ذکر مذکورہ حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں آیا ہے: المتحابون في (اللہ کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے والے)۔ اِس حدیث رسول میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کی ذات سے محبت کرنے والے، بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے۔

گویا اِس کا مطلب یہ ہے کہ خالص اللہ کے کاز (cause) کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے۔ اس معاملے کو مزید واضح کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جو — اللہ کے مشن کی خاطر صرف اللہ کے لیے باہم مجتمع ہوجائیں، جن کی ٹیم اسپرٹ اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ ٹیم کا ہر فرد اُن کے لیے ایک محبوب ساتھی بن جائے۔

دعوت کا عالمی نشانہ صرف ٹیم ورک کے ذریعے پورا کیا جاسکتا ہے اور کسی مادی انٹرسٹ کے بغیر ٹیم ورک ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ٹیم ورک کا مطلب اجتماعی ورک ہے اور اجتماعی زندگی میں لازماً شکایت اور اختلاف کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایسی حالت میں صرف اعلی درجے کی محبت الٰہی یا تعلق باللہ ہی آدمی کو مشن سے وابستہ رکھ سکتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانے میں ایک جنگ پیش آئی جس کو تاریخ میں جنگ یرموک (13 ہجری) کہا جاتا ہے۔ اِس جنگ میں اہلِ ایمان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اِس جنگ میں خالد بن الولید سپہ سالار تھے۔ جنگ کے آخری مرحلے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق نے کسی وجہ سے خالد بن الولید کو سپہ سالاری کے منصب سے ہٹادیا اور ان کو عام سپاہی کا درجہ دے دیا۔ فوج کے کچھ لوگ خالد بن الولید سے ملے اور اِس واقعے پر اپنی عدم رضامندی کا اظہار کیا۔ خالد بن الولید نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: إني لا أقاتل في سبيل عمر، ولكن أقاتل في سبيل رب عمر (یعنی میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ میں عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں)۔

عالمی دعوتی مشن بہت بڑا دعوتی مشن ہے۔ اِس قسم کا مشن صرف ایسے لوگوں کے ذریعے کامیابی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے جو پورے معنی میں ٹیم اسپرٹ کے ساتھ اکھٹا ہوئے ہوں۔ دعوتی مشن ایک ایسا مشن ہے جس میں کسی بھی قسم کا مادی یا ذاتی انٹرسٹ شامل نہیں۔ دعوتی ٹیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر مادی انٹرسٹ کا کوئی اعلی بدل موجود ہو۔ یہ بدل صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کے ساتھ غیر متزلزل محبت۔ اللہ سے یہی گہرا تعلق اس بات کا

ضامن ہے کہ ٹیم کے افراد بنیانِ مرصوص (61:4) کی طرح باہم جڑے رہیں۔ کوئی بھی شکایت اُن کی ٹیم اسپرٹ میں خلل ڈالنے والی نہ ہو۔

اِس معاملے کی ایک مثبت مثال وہ ہے جو خالد بن الولید کے حوالے سے اوپر بیان کی گئی ہے۔ اِس کی مزید وضاحت کے لیے ایک متقابل مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔ یہ مثال سعد بن عبادہ الانصاری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ سعد بن عبادہ انصاری کو اِس پر اختلاف ہوا۔ وہ مدینے کے بڑے سرداروں میں سے تھے۔ ان کی شکایت ایک سیاسی شکایت تھی۔ یہ شکایت اتنی بڑھی کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت پر بیعت نہیں کی۔ انھوں نے کبھی اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ اصحابِ رسول کی جماعت سے الگ ہوکر شام چلے گئے اور وہیں 14 ہجری میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ٹیم ورک کے اندر لازمی طور پر آپس میں شکایت اور اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ٹیم ورک کی کامیابی کی شرط صرف یہ ہے کہ ٹیم کے افراد کے اندر یہ ناقابلِ شکست عزم پایا جاتا ہو کہ وہ کسی بھی عذر کو عذر نہیں بنائیں گے، وہ اللہ کی خاطر ہر حال میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ اللہ کے کاز کے لیے آپس میں محبت کرنے والے شکایت کا کوئی منفی اثر نہیں لیں گے۔ اِس کے برعکس، جن لوگوں کے اندر یہ صفت نہ ہو، وہ شکایت سے بددل ہوکر ٹیم سے دور ہوجائیں گے۔

دینِ خداوندی کے دو تقاضے

اسلام کا اصل خارجی نشانہ دعوت الی اللہ ہے۔ اہلِ اسلام کا یہی ابدی مشن ہے کہ وہ پُرامن طور پر اللہ کے دین کا پیغام ہر دور کے انسانوں تک پہنچاتے رہیں۔ اِس دعوتی مشن کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے — تائیدی انفراسٹرکچر (supporting infrastructure) اور توجیہی لٹریچر (explanatory literature)۔

تائیدی انفراسٹرکچر

قدیم زمانہ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ قدیم زمانے میں صرف ایک چیز تھی جس سے

تائیدی انفراسٹرکچر کا فائدہ حاصل ہوتا تھا، اور وہ تھا پولٹکل انفراسٹرکچر، یعنی سیاسی اقتدار کی سرپرستی حاصل ہونا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیا آئے، اُن کو سیاسی اقتدار کی سرپرستی حاصل نہ تھی، اس لیے اُن کے زمانے میں دعوتِ خداوندی کو استحکام کا درجہ بھی نہ مل سکا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعے اللہ تعالی نے تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے نتیجے میں خود اہلِ اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہوگیا اور اِس طرح دعوت الی اللہ کے کام کے لیے سیاسی اقتدار کی سطح پر وہ تائیدی انفراسٹرکچر قائم ہوا جو کہ دعوتی مشن کے لیے مطلوب تھا۔

لیکن اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، سیاسی اقتدار کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہوسکتا، اِس لیے فطری طور پر ایسا ہونا تھا کہ یہ سیاسی سرپرستی ابدی طور پر قائم نہ رہے۔ اِس لیے تقریباً ایک ہزار سال کے بعد تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا۔ اِس انقلاب کو جمہوری انقلاب (democratic revolution) کہا جاتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، جمہوری انقلاب ایک تاریخی عمل کے تحت وجود میں آیا۔ اِس عمل کا نقطہ انتہا انقلاب فرانس ہے۔

جمہوری انقلاب محدود معنوں میں صرف ایک سیاسی ڈھانچے کی تبدیلی کے ہم معنی نہ تھا، بلکہ اپنے اثرات کے اعتبار سے، وہ ایک مکمل انقلاب (total revolution) تھا۔ اِس کے نتیجے میں آخر کار تاریخ میں ایک نیا دور وجود میں آیا۔ اِس دور میں تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ زندگی کے تمام مواقع ہر انسان کے لیے یکساں طور پر کھل گئے۔ فرد کی آزادی کو خیر اعلی کا درجہ حاصل ہوگیا، ہر انسان کا یہ غیر مشروط حق تسلیم کرلیا گیا کہ وہ پر امن رہتے ہوئے جو چاہے کرے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں جمہوریت (democracy) ایک مسلمہ عالمی اصول (universal norm) بن گئی۔ دعوت الی اللہ کے مشن کے لیے دورِ جمہوریت بہت زیادہ بامعنی تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دعوتی مشن کے لیے جو تائیدی انفراسٹرکچر درکار ہے، اس کے لیے اب مسلم اقتدار کی ضرورت نہیں۔ اب خود عالمی نظام زیادہ بہتر طور پر وہ تائیدی انفراسٹرکچر فراہم کررہا ہے جو دعوت الی اللہ کے عالمی مشن کے لیے مطلوب ہے۔

توجیہی لٹریچر

دعوت الی اللہ کے مشن کی اصل نظریاتی بنیاد صرف قرآن اور سنت ہے۔ قرآن اور سنت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اِس مشن کی نظریاتی بنیاد بن سکے۔ لیکن اِس کے ساتھ ایک اور چیز ہے جو علمی اعتبار سے اس کی لازمی ضرورت ہے۔ یہ قرآن اور سنت کی بنیاد پر تیار کیا جانے والا توجیہی لٹریچر ہے۔

عباسی دور میں مسلم علما نے جو لٹریچر تیار کیا، وہ اِس معاملے کی پہلی مثال ہے۔ یہ لٹریچر اُس دور کے فقہا اور علما نے تیار کیا تھا۔ جلد ہی اِس لٹریچر کو مستند پیٹرن (authentic pattern) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بعد کے زمانے میں جو اسلامی کتابیں لکھی گئیں، وہ اِس پیٹرن پر لکھی گئیں۔ یہ لٹریچر اُس زمانے میں تیار کیا گیا جب کہ زمین کے بڑے حصے میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں۔ اِس ماحول میں ایسا ہوا کہ یہ لٹریچر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی پیٹرن میں ڈھل گیا۔

مثال کے طور پر اِسی دور میں وہ کتابیں لکھی گئیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ شتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔ تمام فقہا نے یہ قانون وضع کر دیا کہ شاتم کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یُقتل حدا)۔ اِسی طرح ارتداد (apostasy) کی سزا قتل قرار پائی۔ اِن قوانین کا ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہ تھا، وہ صرف دورِ سلطنت کے سیاسی ماحول کی پیداوار تھے۔ اِسی طرح اِس دور میں بہت سے مسائل اور قوانین وضع کیے گئے جو صرف وقت کے سیاسی ماحول کی پیداوار تھے۔ مثلاً دار الاسلام اور دار الکفر کی اصطلاحیں، ذمی اور غیر ذمی کے قوانین، وغیرہ۔

اسلامی دعوت کی نظریاتی بنیاد (قرآن وسنت) ہمیشہ ایک ہی رہے گی، لیکن اس کا توجیہی لٹریچر ہمیشہ ایک نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ توجیہی لٹریچر کا تعلق ابدی حقائق سے نہیں ہے، بلکہ حالاتِ زمانہ سے ہے۔ قدیم زمانے میں جو توجیہی لٹریچر تیار ہوا تھا، وہ قدیم سیاسی حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب اس کی حیثیت کلاسکل لٹریچر (classical literature) کی ہو چکی ہے۔ آج کے حالات کے اعتبار سے اس کا ریلونس (relevance) تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب نئے حالات کے اعتبار سے نیا توجیہی لٹریچر درکار ہے جو جدید ذہن کو ایڈریس کر سکے۔

آج اسلام کے دعوتی مشن کے لیے ایسا لٹریچر درکار ہے جو روحِ عصر (spirit of the age) کے مطابق ہو۔ صرف ایسا لٹریچر ہی جدید ذہن کو ایڈریس کرسکتا ہے اور لوگوں کو یہ یقین عطا کرسکتا ہے کہ اسلام میں آج کے انسان کے لیے بھی اُسی طرح قابلِ اعتماد رہنمائی موجود ہے جس طرح قدیم انسان نے اس میں اپنے لیے قابلِ اعتماد رہنمائی پائی تھی۔

موجودہ زمانے میں اسلام کے لیے جو نیا توجیہی لٹریچر درکار ہے، اس کی چند خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ وہ اپنے دلائل کے اعتبار سے مبنی برعقل (reason based) ہو۔ قدیم روایتی طریقہ آج کے لیے کارآمد نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا اپروچ یونی ورسل اپروچ (universal approach) ہو۔ قدیم انداز کا گروہی اپروچ (sectarian approach) آج کے انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ اِس لٹریچر کو مکمل طور پر پیس فل (peaceful) لٹریچر ہونا چاہئے۔ کوئی ایسا لٹریچر جس کے اندر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تشدد (violence) کا فکر موجود ہو، وہ آج کے انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا — آخرت میں قابلِ رشک درجہ اُس گروہ کو ملے گا جو اِن تقاضوں کے مطابق، اکیسویں صدی میں دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے۔

احیاءِ امت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ طولِ امد کے نتیجے میں امتوں کے اندر قساوت (57:16) پیدا ہوجاتی ہے، یعنی ہر امت کی بعد کی نسلوں میں زوال آتا ہے۔ امت میں زوال کے بعد احیا (57:17) کے لیے کیا کرنا چاہیے، قرآن میں اس کا ایک ماڈل حضرت موسیٰ کی مثال کی صورت میں بتایا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک مستند ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے، اِسی طرح حضرت موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کی زندگی بھی اہلِ ایمان کے لیے ایک قابلِ تقلید ماڈل ہے (6:90)۔

حضرت موسیٰ ایک اسرائیلی پیغمبر تھے۔ وہ قدیم مصر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا زمانہ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ ان کے حالات تفصیل کے ساتھ قرآن، اور بائبل میں موجود ہیں۔ اِس کے مطالعے سے جہاں دوسری باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک زوال یافتہ امت کوزوال کی حالت سے نکالنے کے لیے عملی طور پر کیا کرنا چاہئے۔

اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو دو کام سپرد ہوا تھا — ایک طرف، فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانا اور دوسری طرف، بنی اسرائیل کو زوال کی حالت سے نکالنے کی تدبیر کرنا۔ انھوں نے یہ دونوں کام پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ایک طرف، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اللہ کی حجت تمام کی اور دوسری طرف، بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے۔ اِس کا مقصد زوال یافتہ قوم کی اصلاح کرنا تھا۔

فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ کے پیغام کو ماننے سے انکار کردیا۔ اتمامِ حجت کے بعد اللہ نے اُن کے ساتھ اُسی انجام کا فیصلہ کیا جو اِس طرح کی دوسری قوموں کے ساتھ اللہ کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے، یعنی اُن کی کامل ہلاکت۔ چناں چہ فرعون، اس کی فوجی طاقت، اس کے درباری سب کے سب بیک وقت سمندر میں غرق کردئے گئے۔

ایک تخمینے کے مطابق، اُس وقت مصر کی کُل آبادی تین ملین سے کچھ زیادہ تھی- اِس آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً ایک چوتھائی حصے پر مشتمل تھی- اگر حضرت موسی کے نزدیک بنی اسرائیل کے احیاءِ نو کا طریقہ یہ ہوتا کہ اُن کو حکومت دلائی جائے یا ملک میں اُن کے سیاسی ادارے قائم کیے جائیں، تو فرعون کی غرقابی کے بعد اِس منصوبے کو عمل میں لانے کا وقت اس کے لیے بہترین وقت تھا- غرقابی کا واقعہ پیش آنے کے بعد فرعون کی سیاسی اور فوجی طاقت ختم ہوچکی تھی- جادوگروں کا طبقہ حضرت موسی کے دین کو اختیار کرچکا تھا-

اِس طرح کے واقعات کے نتیجے میں پورے مصر میں حضرت موسی اوران کی قوم کا دبدبہ قائم ہو چکا تھا- اِس طرح حالات پوری طرح تیار ہو چکے تھے کہ حضرت موسی مصر کی حکومت پر قبضہ کرلیں اور سیاسی اقتدار کے ذریعے بنی اسرائیل کے احیاءِ نو کا کام کریں-

مگر حضرت موسی نے ایسا نہیں کیا- اِس کے برعکس، حضرت موسی نے جو کچھ کیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر کو چھوڑ دیا اور بنی اسرائیل کی پوری جمعیت کو لے کر صحرائے سینا میں چلے گئے، جہاں مشقت کی زندگی کے سوا بنی اسرائیل کے لیے کچھ اور نہ تھا- اِس واقعے کا حوالہ قرآن کی سورہ المائدہ کی آیت نمبر 26 میں دیا گیا ہے- اِس صحرائی ماحول میں بنی اسرائیل چالیس سال (1400-1440 قبل مسیح) تک سخت مشقت کی زندگی گزارتے رہے، یہاں تک کہ ایسا ہوا کہ اُن میں جو زیادہ عمر کے لوگ تھے، وہ سب مر گئے اور جو نوجوان تھے، وہ صحرا کے پُرمشقت ماحول میں تربیت پا کر ایک نئی زندہ قوم کی صورت میں ابھرے- بنی اسرائیل کی یہی تربیت یافتہ نسل تھی جس نے بعد کے دور میں تاریخی کارنامے انجام دئے-

بنی اسرائیل کے ساتھ جو طریقہ اختیار کیا گیا، اُس کو صحرائی طریقِ علاج (desert therapy) کہا جاسکتا ہے- صحرائی علاج کا یہ طریقہ اِس سے پہلے بنو اسماعیل کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا- وہ عرب کے صحرا میں تربیت پا کر تیار ہوئے اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ایک طاقت ور ٹیم کی صورت میں انھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے-

امت مسلمہ کا کیس

قانونِ فطرت کے مطابق، امت مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں وہی زوال آنا مقدر تھا جو اِس سے پہلے بنی اسرائیل پر آیا۔ زوال کی یہ حالت اپنی آخری صورت میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں کھل کر سامنے آگئی۔

اب امت کے رہنماؤں کو وہی کرنا تھا جو اِس سے پہلے حضرت موسی نے اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، یعنی زمانے کے اعتبار سے امت کو ایک تربیتی کورس سے گزارنا، تاکہ اُن پر قرآن کی یہ آیت صادق آجائے: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (8:42)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے جو نا قابلِ اصلاح افراد ہیں، وہ ختم ہوجائیں اور جو قابلِ اصلاح افراد ہیں، وہ بیدار ہو کر مطلوب رول ادا کرنے کے قابل ہوسکیں۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ زمانے میں اِس طریقِ علاج کا بہترین میدان وہ تھا جس کو سیکولر تعلیم کا نظام کہا جاتا ہے۔ یہی تعلیمی نظام مکمل طور پر مسابقت (competition) کے اصول پر قائم تھا۔ یہاں دوسری قوموں کی طرف سے چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ یہاں کا فارمولا یہ تھا کہ — مقابلہ کرکے زندہ رہو یا مرجاؤ:

Compete or perish

اِس اعتبار سے، موجودہ زمانے کا سیکولر تعلیمی نظام گویا تعلیمی طریقِ علاج (educational therapy) کا میدان بن گیا تھا۔ ضرورت تھی کہ قوم کے تمام نوجوانوں کو اِس طریقِ علاج کے پراسس سے گزارا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے علما اور رہنماؤں نے اِس حکمت کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اس معاملے کی حکمت سے بے خبر رہتے ہوئے یہ اعلان کردیا کہ یہ تعلیمی نظام تمام تر اینٹی مسلم نظام ہے۔ چناں چہ کسی نے اِس نظام کو 'قتل گاہ' قرار دیا۔ اور کسی نے اس کو 'ذہنی ارتداد' کا کارخانہ قرار دیا، وغیرہ۔

موجودہ سیکولر تعلیمی نظام میں چیلنج اور مسابقت کا مطلوب ماحول پوری طرح موجود تھا۔ لیکن اس میں ایک چیز مفقود تھی، وہ تھی مسلم نوجوانوں کی دینی تعلیم وتربیت۔ اِس مسئلے کا حل قرآن میں،

بنی اسرائیل کے حوالے سے اِن الفاظ میں موجود تھا: وَّاجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً (10:86) یعنی اپنے گھروں کو مذہبی تعلیم وتربیت کا مرکز بنادو۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہی کرنا تھا۔ وہ یہ کہ مدرسے کی تعلیم کے علاوہ، مسلم نوجوانوں کی باقاعدہ تعلیم (formal education) وہ سیکولر تعلیم گاہوں میں دلوائیں اور اِسی کے ساتھ وہ اپنے گھروں کو انفارمل ایجوکیشن (informal education) کا مرکز بنادیں۔ تاکہ دونوں تقاضے بحسن وخوبی پورے ہوسکیں۔

مگر مسلم رہنماؤں نے اِس کے برعکس، یہ کیا کہ انھوں نے قومی بنیاد پر مسلمانوں کے الگ تعلیمی ادارے قائم کیے۔ یہ تعلیمی ادارے، جہاں صرف مسلمانوں کے لیے تعلیم کا انتظام تھا، وہ فطری طور پر مسابقت اور چیلنج سے خالی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یہ ادارے مسلم گھیٹو (Muslim ghetto) بن کر رہ گئے۔

موجودہ زمانے کے مسلمان اپنے زوال کی بنا پر اِس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ خود اپنے الگ قومی ادارے چلائیں۔ اِس طرح کے ادارے قائم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زوال یافتہ افراد کو حقیقی لیاقت کے بغیر، بڑی بڑی پوزیشن دے دی جائے۔ چناں چہ اِن اداروں میں اسلام تو نہیں آیا، البتہ ایک زوال یافتہ قوم کا قومی کلچر فروغ پانے لگا۔ یہی حال اُن ملکوں کا ہوا جو اسلام کے نام پر بنائے گئے تھے۔ اِن ملکوں میں زوال یافتہ افراد کو اچانک بڑے بڑے عہدے مل گئے اور انھوں نے پورے ملک کو زوال یافتہ کلچر کا جنگل بنادیا۔

زوال کی آخری مثال

دورِ زوال کے بارے میں حدیث میں بہت سے انتباہات آئے ہیں۔ اُن میں سے ایک انتباہ وہ ہے جو اِس حدیثِ رسول میں ملتا ہے: لا ترجعوا بعدي كفاراً، يضرب بعضكم رقاب بعض (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1739) یعنی میرے بعد تم کافر نہ ہوجانا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی گردنیں مارنے لگے۔ اِس حدیث میں ''کفار'' کا لفظ فقہی معنی میں نہیں ہے، یہ دراصل

تہدیدی زبان (language of hammering) ہے۔

یہ شدت کے انداز میں بتایا گیا ہے کہ زوال جب اپنی آخری حد تک پہنچتا ہے تو امت کا حال کیا ہوتا ہے۔ اُس وقت لوگوں کے اندر خوفِ خدا کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اِسی بےخوف نفسیات کی بنا پر وہ ایسا فعل کرنے کے لیے جری ہوجاتے ہیں جو قرآن کی صراحت کے مطابق، مبینہ طور پر ایک جہنمی فعل (4:93) ہے، یعنی ایک مومن کا دوسرے مومن کو ناحق قتل کرنا۔

جدید تعلیم کی اہمیت

جدید تعلیمی نظام کو سیکولر نظامِ تعلیم کہا جاتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جدید تعلیم نئے دور کا نظامِ تعلیم تھا۔ وہ نئے دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس کا سیکولر پہلو اس کا اضافی (relative) پہلو ہے، نہ کہ حقیقی (real) پہلو۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو نئی دریافتیں ہوئیں، اُس نے زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ اِن تبدیلیوں کا تعلق براہِ راست طور پر انسان کی عملی زندگی سے تھا۔ دورِ جدید میں زندگی کے تمام شعبے مکمل طور پر بدل گئے۔ اِن شعبوں کو چلانے کے لیے نئے ماہرین اور نئے تربیت یافتہ افراد درکار تھے۔ جدید تعلیمی نظام گویا اِنھیں جدید قسم کے افراد کو تیار کرنے کا کارخانہ تھا۔ کسی قوم کے لیے اِس تعلیمی نظام سے علاحدگی کا مطلب یہ تھا کہ اُس قوم کے پاس موجودہ دور کے اِس جدید نقشۂ حیات کو چلانے کے لیے افرادِ کار موجود نہ ہوں۔

موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کا کیس یہی ہے۔ اپنے قائدین کی رہنمائی میں امت نے یہ غلطی کی کہ وہ جدید تعلیمی اداروں کی عصری اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اپنے نوجوانوں کو اِس تعلیمی نظام سے دور رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت دورِ جدید میں بے جگہ (displaced) ہو کر رہ گئی — موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی مبینہ پس ماندگی کا اصل سبب یہی ہے۔

افراد، نہ کہ مجموعہ

موجودہ زمانے میں مسلم علما اور رہنماؤں نے بہت سی تحریکیں چلائیں، لیکن ہر تحریک اپنے مطلوب

نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اِس ناکامی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ہر ایک نے غلط مفروضے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے موجودہ مسلمانوں کو ''خیرِ امت'' فرض کرلیا اور اِسی مفروضے پر وہ اپنی منصوبہ بندی کرنے لگے، حالاں کہ موجودہ مسلمان صرف ایک زوال یافتہ گروہ بن چکے تھے۔

یہ ایک مشترک غلطی تھی جس میں یہ تمام حضرات مبتلا رہے۔ اِس بنا پر اُن کا حال اُس معمار جیسا ہوگیا جو کچی اینٹوں کو پختہ اینٹ سمجھ کر قلعے کی تعمیر شروع کردے۔ ایسے معمار کا یقینی انجام صرف یہ ہے کہ اس کا قلعہ کبھی تعمیر نہ ہوسکے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی زوال یافتہ قوم دوبارہ اس طرح اصلاح قبول نہیں کرتی کہ پوری قوم بطور مجموعہ اصلاح یافتہ ہوجائے (21:95)۔ ایسا نہ ماضی میں کبھی ہوا اور آئندہ کبھی ہوسکتا ہے۔ اِس بنا پر اصلاح کے کام میں خواہ پورے مجموعے کو خطاب کیا گیا ہو، لیکن ہمیشہ کچھ افراد ہی اُس سے اصلاح قبول کرتے ہیں۔ اِس لیے تحریک کی کامیابی کا معیار ہمیشہ افرادِ قوم ہوتے ہیں، نہ کہ مجموعۂ قوم۔

انگریزی تعلیم

ٹی بی میکالے (Thomas Babington Macaulay) ایک انگریز مورخ اور سیاست داں تھا۔ وہ 1800 میں پیدا ہوا، اور 1859 میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ 1835 میں انڈیا آیا۔ اُس وقت کی برٹش حکومت میں اس کو ایک بڑا عہدے دار بنایا گیا۔ اس نے ایک تعلیمی نظریہ وضع کیا جس کو میکال ازم (Macaulayism) کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد تھا ملک میں اینگلی سائزڈ انڈین (anglicised Indians) کا ایک نیا طبقہ پیدا کرنا۔

لارڈ میکالے سے پہلے انڈیا کی آفیشیل زبان فارسی تھی۔ لارڈ میکالے کی کوششوں سے ایسا ہوا کہ 1938 میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اِس کے بعد ملک کے اسکولوں میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی۔

لارڈ میکالے کا کہنا تھا کہ — اس سے ایک نئی نسل پیدا ہوگی جو کہ پیدائش کے اعتبار سے

ہندستانی اور اپنے ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو گی:

So that a generation may arise which is Indian in birth and English in thought.

لارڈ میکالے نے جب یہ کہا تو اس کے خلاف سخت ہنگامہ کیا گیا، خاص طور پر مسلم رہنما انگریزی تعلیم کے شدید مخالف ہو گئے، حتی کہ انھوں نے کہا کہ انگریزی تعلیم گاہیں مسلمانوں کے لیے قتل گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب غیر ضروری اندیشے تھے۔ عملاً جو کچھ ہونے والا تھا، وہ صرف یہ کہ اِن درس گاہوں میں تعلیم پانے کی وجہ سے کٹر پن ختم ہو جائے اور لوگوں کے اندر کھلا پن آ جائے۔ اپنے نتیجے کے اعتبار سے دیکھئے تو لارڈ میکالے کا قول ایک لفظی تبدیلی کے ساتھ دراصل یہ تھا:

So that a generation may arise which is Indian in birth and liberal in thought.

چناں چہ تجربہ بتاتا ہے کہ اِن انگریزی اداروں میں تعلیم پائے ہوئے مسلم نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو بعد کو بہترین مسلمان بنے۔ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو انھیں انگریزی اداروں سے بہترین افراد حاصل ہوئے، وغیرہ۔ اِس معاملے میں اصل قابلِ لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ لارڈ میکالے یا برٹش حکمرانوں نے بطور خود کس نظریے کے تحت انگریزی تعلیم گاہیں بنائیں، بلکہ اصل قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ باعتبار نتیجہ ان کا انجام کیا ہوا، اور یہ کہ یہاں سے کس قسم کے لوگ تعلیم پا کر نکلے۔

انگریزی تعلیم حقیقتاً برٹش تعلیم نہ تھی، بلکہ وہ جدید علم (modern learning) کے حصول کا ذریعہ تھی۔ ماڈرن ایجوکیشن اپنی حیثیت کے اعتبار سے نہ پرو برٹش (pro-British) تھی اور نہ اینٹی مسلم، وہ صرف جدید علوم تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی۔ ''انگریزی تعلیم'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی جمود ٹوٹا، ان کے اندر کھلا پن آیا، ان کے اندر متعصّبانہ طرز فکر (biased thinking) کا خاتمہ ہوا، وہ چیزوں کو موضوعی انداز (objective way) میں دیکھنے لگے، ان کے اندر کٹر پن ختم ہو گیا، ان کے اندر چیزوں کو عقل (reason) کے معیار پر جانچنے کا مزاج پیدا ہو گیا، وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں عین دینِ حق کے موافق تھیں، کیوں کہ دینِ حق انسانی فطرت کے عین مطابق ہے،

وہ عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ دینِ حق کے راستے میں اگر کوئی چیز رکاوٹ ہے تو وہ صرف متعصّبانہ طرزِ فکر ہے۔ کسی بھی طریقے سے اگر متعصّبانہ طرزِ فکر کو ختم کر دیا جائے تو دینِ حق اور انسان کے درمیان حائل فکری دیوار اپنے آپ منہدم ہو جائے گی۔ اس کے بعد انسان اِس قابل ہو جائے گا کہ وہ حقیقت کو اس کی بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔

انگریزی تعلیم یا سیکولر تعلیم کے ذریعے یہی واقعہ پیش آیا۔ اِس تعلیم کے ذریعے بہت سے نوجوان اِس قابل ہو گئے کہ وہ حقیقت کو دریافت کر کے اس کو قبول کر لیں۔ موجودہ زمانے میں اِس طرح کی مثالیں ہر مقام پر دیکھی جا سکتی ہیں — قدیم زمانہ قیاسی استدلال کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ سائنسی استدلال کا زمانہ ہے۔ آج کے انسان کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے کے لیے سائنسی استدلال کی ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم نے اِسی دروازے کو کھولا تھا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی صورتِ حال پیش آئے تو اگر چہ وہ بظاہر عُسر دکھائی دیتی ہو تب بھی آپ اس کے اندر یُسر تلاش کریں۔ ہر نئی صورتِ حال ہمیشہ نئے مواقع کو لاتی ہے۔ ایسی حالت میں اصل کام صرف یہ ہے کہ مواقع کو دریافت کر کے ان کو اپنے حق میں استعمال کیا جائے۔

اسلام اور مسلمان

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کا مشن نہایت تیزی کے ساتھ پھیلا، یہاں تک کہ تقریباً 50 سال کے عرصے میں آپ کے ماننے والوں نے ایشیا اور افریقہ اور یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرلیں۔ مسلمانوں کا یہ دبدبہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اِس کے بعد وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (3:140) کے فطری قانون کے تحت حالات بدلے۔ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کا دور آیا۔ یورپی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہوکر دنیا کے بیش تر حصے میں پھیل گئیں۔ یہ وہی دور تھا جس کو مسلم ایمپائر کا دور کہا جاتا ہے۔ فطری طور پر یورپی قوموں کا مقابلہ براہِ راست مسلم سلطنتوں سے ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ اِس معاملے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ایک طرف، عثمانی سلطنت کو یورپی طاقت کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1770 میں ترکوں کے مضبوط بحری بیڑے کو ایک لڑائی میں میڈی ٹیرینین سمندر میں تباہ کر دیا گیا:

> The Ottoman naval establishment was wiped out at the Battle of Çeşme (1770) by a Russian fleet. (EB. 13/784)

اِس سلسلے میں دوسرا واقعہ ہندستان میں پیش آیا۔ اُسی زمانے میں برٹش فوجیں ہندستان میں داخل ہوئیں اور تیزی سے پیش قدمی کرنے لگیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اُن کا مقابلہ میسور کے سلطان ٹیپو سے پیش آیا۔ برٹش فوجیں کامیاب ہوئیں اور 1799 میں انھوں نے سری رنگا پٹنم میں سلطان ٹیپو کو ہلاک کرکے میسور کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اُس وقت سلطان ٹیپو کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر جنرل ہیرس (George Harris) نے فاتحانہ انداز میں کہا تھا کہ — آج ہندستان ہمارا ہے:

> Today, India is ours!

نئی سوچ کی ضرورت

اِس کے بعد مغربی قوموں کے خلاف مسلمانوں کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ یہ ٹکراؤ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان دو صدیوں تک مسلسل جاری رہا۔ اِس طویل جنگ میں مسلمانوں کو ساری دنیا میں یک طرفہ طور پر تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ اب اِس تباہ کن لڑائی کی تاریخ اکیسویں صدی میں پہنچ چکی ہے۔ اب حالات اُس سنگین حد تک پہنچ چکے ہیں، جب کہ اِس تباہ کن لڑائی کو مزید جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کے علما اور دانش ور یہ فیصلہ کریں کہ اب ہمیں پورے معاملے کا ازسرِ نو جائزہ لینا ہے۔ اب ہمیں ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے احیاءِ ملت کی نئی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ دو سو سال کا ناکام تجربہ یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ ماضی کی پالیسی کو بدستور جاری رکھنا، اب صرف دیوانگی ہے، نہ کہ کوئی دانش مندی۔

اسلام کے عملی اصول میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو نظر ثانی (reassessment) کا اصول کہا جا سکتا ہے۔ فطرت کے نظام کے مطابق، یہ ممکن ہے کہ آدمی نظریہ (ideology) کی سطح پر ہمیشہ ایک ہی آئڈیل اصول پر قائم رہے، لیکن عمل کی دنیا میں آنے کے بعد ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی عملی تقاضے کی نسبت سے اپنے منصوبے پر نظر ثانی کرنا، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ازسرِ نو اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ یہ اسلام کا تقاضا بھی ہے اور عقل کا تقاضا بھی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اِس عملی اصول کے تحت اپنی سرگرمیوں کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور حقائق (realities) کی بنیاد پر اپنے عمل کا نیا نقشہ بنائیں، جو حالات کے مطابق، قابلِ عمل بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی۔

اسلامی لٹریچر کا معاملہ

اسلام استثنائی طور پر ایک ایسا مذہب ہے جس کا اصل متن (original text) آج بھی محفوظ طور پر موجود ہے۔ یہی متن (قرآن اور سنت) اسلام کی تعلیمات کو جاننے کا واحد ماخذ ہے۔ اسلام کا یہ تاریخی پہلو اسلام کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ مگر اسلام کی بعد کی

صدیوں میں یہ ہوا کہ اسلام کے متن کی تشریح وتفصیل کے طور پر ہزاروں کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ بعد کو لکھی جانے والی یہ کتابیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کا اصل ماخذ قرار پاگئیں۔ اب یہی کتابیں مدرسوں اور اداروں اور لائبریریوں میں استعمال ہوتی ہیں، ہر جگہ اُنھیں کا چرچا ہوتا ہے، حتی کہ عملاً اب قرآن اور سنت کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے اور بعد کو پیدا ہونے والے لٹریچر کو بلا اعلان اسلام کے اولین لٹریچر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اب موجودہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ فکری حیثیت سے وہ دینِ منزّل پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں، اب عملاً وہ اُس دین پر کھڑے ہوئے ہیں جو بعد کی صدیوں میں مسلم علما نے اصل دین کی تشریح وتفصیل کی حیثیت سے بطور خود مدوّن کیا۔ مسلمانوں کی یہ صورتِ حال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس پیشین گوئی کی تصدیق ہے جو حدیث کی کتابوں میں اِن الفاظ میں آئی ہے: من اقتراب الساعة أن يرفع الأشرار، ويوضع الأخيار، ويوضع في القوم المثناة، ليس أحد يغيرها، قيل: وما المثناة - قال: كتاب كتب سوى كتاب الله عز وجل (المستدرك على الصحيحين، رقم الحديث: 8782) یعنی قربِ قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ برے لوگوں کو بلندی حاصل ہوجائے گی، اور اچھے لوگوں کو ذلیل کیا جائے گا، اور لوگوں کے درمیان 'مثناۃ' کا رواج عام ہوجائے گا، کوئی نہ ہوگا جو اس کی تغییر کرے۔ پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ کی کتاب کے سوا لکھی جانے والی کتابیں۔

اِس حدیث میں دراصل امتِ مسلمہ کے زوال کی حالت کو بتایا گیا ہے۔ جب ملت پر زوال کا دور آتا ہے تو اس کی حالت بھی وہی ہوجاتی ہے جو دوسری ملتوں کی ہوئی، یعنی لوگ ظاہر پسند بن جاتے ہیں۔ اُن کو معنوی حقائق دکھائی نہیں دیتے، البتہ ظاہری چیزیں خوب نظر آتی ہیں۔ لوگوں کے اِس بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر اُن کے درمیان دنیا پرست قسم کے لوگ ابھرتے ہیں اور آخرت پسند قسم کے لوگ غیر نمایاں بن جاتے ہیں۔ جو لوگ بگڑے ہوئے عوامی ذوق کو غذا فراہم کریں، وہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور جو لوگ اپنی سنجیدگی کی بنا پر عوامی ذوق کی رعایت نہ کرسکیں، وہ اُن کے درمیان

غیر مقبول بن جاتے ہیں۔اُس وقت ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو اگر چہ روحانی اعتبار سے خالی ہوتے ہیں، لیکن اپنے شان دار مذہبی لباس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنے کو نمایاں بنا لیتے ہیں۔ان کے خوش نما الفاظ، ان کا بناوٹی انداز، ان کی بڑی بڑی باتیں عوام کو اپیل کرتی ہیں۔ایسے لوگ حقیقت کے اعتبار سے، اگر چہ ''اشرار'' ہوتے ہیں، لیکن عوام کے بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر وہ اُن کے درمیان ''اَخیار'' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کی تقریر اور تحریر کو حدیث میں 'مثناۃ' کہا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں اللہ کی کتاب کے سوا جن کتابوں کا ذکر ہے، اُن سے مراد عام کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ان سے مراد وہ کتابیں ہیں جو امت کے بعد کے زمانے میں دینِ خداوندی کی تفسیر اور تشریح کے طور پر لکھی جائیں۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِن قابلِ ترک کتابوں سے مراد وہ کتابیں ہیں جو اُس زمانے میں لکھی جائیں جو 'قُرون مشہود لہا بالخیر' کے بعد کا زمانہ ہے۔اِس قسم کی کتابیں پچھلی امتوں کے زمانۂ مابعد میں لکھی گئی تھیں، اِسی طرح وہ یقینی طور پر خود امتِ مسلمہ کے زمانۂ مابعد میں بھی لکھی جائیں گی۔اِس معاملے میں کسی حاملِ کتاب امت کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابیں دو قسم کی ہوسکتی ہیں — ایک وہ جو کتاب اللہ کے گہرے مطالعے کے بعد اس کی حقیقی وضاحت کے طور پر لکھی جائیں۔اور دوسری کتابیں وہ ہیں جو دورِ زوال میں لوگوں کے بگڑے ہوئے ذوق کی رعایت کے طور پر لکھی جائیں۔مذکورہ حدیث میں 'مثناۃ' کے نام سے جن کتابوں کا ذکر ہے، وہ یہی دوسرے قسم کی کتابیں ہیں۔امتِ مسلمہ کے بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اُس وقت لکھی گئیں، جب کہ مسلمان ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہے تھے، بلکہ وہ عام قوموں کی طرح ایک قوم بن چکے تھے، چناں چہ اِن کتابوں میں ایک مشترک خامی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی ذہن کی عکاسی کرتی ہیں، نہ کہ اسلام کے اصولی موقف کی۔

بعد کے دور میں مسلمان دوسری قوموں کو مدعو کے بجائے محکوم کی نظر سے دیکھنے لگے، اِس لیے ایسا ہوا کہ بعد کے دور میں پیدا ہونے والے لٹریچر میں دعوت الی اللہ کا باب حذف ہوگیا۔بعد کے دور میں

جب کہ مسلمانوں کا پولٹکل ایمپائر قائم ہوا، اُس وقت مسلمانوں میں عام طور پر سیاسی طرزِ فکر پیدا ہوگیا۔ اِس سیاسی ذہن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے مسلمانوں میں جہاد کے نام پر قتال (جنگ) کا تصور غالب آ گیا، حتی کہ قتال اُن کے لیے مذہبی عقیدے کا جز بن گیا، جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قتال کو صرف ضرورتِ شدیدہ (law of necessity) کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو دبدبہ حاصل ہوا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر فخر (pride) کا ذہن پیدا ہوگیا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں، اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگے۔ اِسی ذہن کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے زیرِ قبضہ علاقوں کو 'دار الاسلام' اور دوسروں کے زیر قبضہ علاقوں کو 'دار الکفر' کہنا شروع کردیا، حالاں کہ قرآن کے مطابق، تمام دنیا یکساں طور پر دار الانسان کی حیثیت رکھتی تھی۔ دار الکفر اور دار الاسلام کی اصطلاحیں سرتاسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں جو بعد کے دور میں وضع کی گئیں۔ اِسی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانے میں اسلام کو صرف احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ سمجھ لیا گیا، اِسی ذہن کا نتیجہ تھا کہ علما کے درمیان علم فقہ کو غلبہ حاصل ہوگیا اور قرآن اور حدیث عملاً فقہ کے تابع قرار پا گئے۔ دورِ زوال کا یہ بھی ایک ظاہرہ ہے کہ دین میں اسپرٹ (spirit) کی اہمیت گم ہوجاتی ہے اور ساری اہمیت فارم (form) کو حاصل ہوجاتی ہے۔ اِس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین میں ساری بحثیں فنی اور قانونی پہلوؤں پر مرتکز ہوجاتی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ایک شدید تر خرابی پیدا ہوجاتی ہے، یعنی بہت سے فرقوں کا وجود میں آنا۔ یہاں پہنچ کر ملتِ واحدہ، ملتِ متفرقہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بعد کے دور میں ملتِ مسلمہ کے درمیان یہ تمام خرابیاں کامل طور پر پیش آئیں۔ اِن تمام خرابیوں کا سبب وہی چیز ہے جس کو مذکورہ حدیث میں 'مثناۃ' کہا گیا ہے، یعنی ملت کے دورِ زوال میں پیدا ہونے والا لٹریچر۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے تمام فکری مسائل براہِ راست طور پر اِسی صورتِ حال کا نتیجہ ہیں۔ اب اِس صورتِ حال کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد مسلمانوں نے عربی زبان میں بطور خود جو لٹریچر تیار کیا، اُن کتابوں کو اب مسلمانوں کے کلاسکل لٹریچر (classical literature) کا درجہ دے دیا جائے۔ اب دوبارہ

کھلے ذہن کے تحت قرآن اور سنت کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو جدید ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ بعد کے پیدا شدہ لٹریچر کی تاریخی حیثیت ہمیشہ باقی رہے گی، لیکن جہاں تک ماخذ کی بات ہے، اسلام میں مستند ماخذ کی حیثیت ہمیشہ قرآن اور سنت کو حاصل رہے گی۔

ایک ''روشن خیال'' مسلمان نے ایک بار لکھا تھا کہ — آج قرآن کو دوبارہ نازل ہونا چاہیے:

Quran has to be re-revealed today.

یہ ایک صحیح بات ہے جس کو غلط الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آج ہم کو نئے قرآن کی ضرورت نہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلوبِ عصر میں قرآن کی تبیین کی جائے۔ چناں چہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

Quran has to be re-defined today.

قرآن کی تمام تعلیمات ابدی ہیں تاہم اسلوب کلام کا تعلق مخاطب گروہ سے ہے، اِس لیے اسلوب کلام ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ قرآن کی ابدی تعلیمات کو اسلوبِ عصر میں اِس طرح بیان کیا جائے کہ وہ آج کے لوگوں کے لیے قابل فہم بن سکیں۔

ملتِ مسلمہ کا کیس

ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے آج محرم 1434 کی پہلی تاریخ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی تھی، اُس پر اب 1433 سال گزر چکے ہیں۔ آپ کے زمانے میں جس ملتِ مسلمہ کی تشکیل ہوئی تھی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ اب ختم ہوچکی ہے۔ آج جس کو ہم ملتِ مسلمہ کہتے ہیں، وہ ملت کی بعد کی نسلیں ہیں جو مختلف حالات سے گزرتے ہوئے اکیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر امت اپنے بعد کے دور میں زوال کا شکار ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان، قرآن کی زبان میں، خیرِ امت (3:110) نہیں ہیں، وہ بعد کے دور میں وجود میں آنے والے ایک زوال یافتہ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا کیس وہی ہے جس کو قرآن میں 'طولِ امد' کے ذریعے پیدا ہونے والی قساوت (57:16) کا کیس کہا گیا ہے۔

تحریکوں کی ناکامی کا سبب

پچھلے دوسوسال کے اندر مسلم علما اور مسلم رہنماؤں نے ملت کے احیا کے لیے بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں اور بہت سی بڑی بڑی جماعتیں بنائیں۔ اِن تحریکوں اور جماعتوں کے تحت جو پُر جوش سرگرمیاں جاری ہیں، ایک فارسی شاعر کے الفاظ میں، اُن کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

زمیں شش شد و آسماں ہشت شد

مگر یہ تحریکیں اپنے اعلان کردہ مقصد کے اعتبار سے مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب صرف ایک تھا، وہ یہ کہ اِن رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کو "خیر امت" فرض کر کے اپنا کام شروع کیا، جب کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ انبوہ ایک زوال یافتہ گروہ کے درجے میں پہنچ چکا تھا۔

اصلاح کا آغاز افراد سے

دورِ زوال کی نفسیات یہ ہے کہ زوال اگرچہ عمومی سطح پر ہوتا ہے، لیکن اصلاح کا آغاز افراد کی سطح سے کیا جاتا ہے۔ دورِ زوال میں مجموعی اصلاح کا طریقہ سراسر بے معنی ہے۔ قرآن کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں کام کا آغاز اصلاحِ افراد سے کیا جائے، یعنی بھیڑ کو ایڈریس کرنے کے بجائے افراد کو ایڈریس کرنا۔ اصلاح کی اِس حکمت کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

1۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (8:53) یعنی یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ اُس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک، اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

2۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (13:11) یعنی بے شک، اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک وہ اُس کو نہ بدل ڈالیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔

قرآن کی اِن دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے، وہ یہ کہ جب کوئی قوم عروج کے بعد زوال کا شکار ہو جائے اور اس کو دوبارہ عروج کی طرف لوٹانا ہو تو اصلاح کے کام کا آغاز مجموعی قوم کی سطح سے

شروع نہیں کیا جائے گا، بلکہ افراد کی سطح سے شروع کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا جائے گا کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ قوم تو موجود ہے، اب اُس کو صرف اجتماعی اقدام کی طرف متحرک کرنا ہے، بلکہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ قوم موجود نہیں ہے اور افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ قوم کو وجود میں لانا ہے۔ یہی اللہ کا قانون ہے، اور اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (33:62)۔

اِس معاملے کی ایک واضح عملی مثال موجودہ زمانے میں پائی جاتی ہے، اور یہ فلسطین اور پاکستان کی مثال ہے۔ دونوں کا کیس بالکل ایک ہے۔ فلسطین کا تعلق عرب دنیا سے ہے، اور پاکستان کا تعلق بقیہ مسلم دنیا سے۔ فلسطین اور پاکستان کا معاملہ گویا موجودہ زمانے میں اِس قانونِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے عملی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسطین اور پاکستان دونوں کے کیس میں ایسا ہوا کہ قوم کی سطح پر ایک مسلم ملک وجود میں لانے کی کوشش کی گئی، مگر دونوں جگہ مکمل طور پر ناکامی ہوئی۔ فلسطین کا مسئلہ 1948 میں شروع ہوا۔ فلسطینی جدوجہد پر اب 60 سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ اِس جدوجہد میں جان و مال کی جو قربانی دی گئی ہے، وہ شاید پوری مسلم تاریخ کی تمام قربانیوں سے بھی زیادہ ہے، مگر انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پوری جدوجہد معکوس نتیجہ (counter productive) کی بدترین مثال ثابت ہوئی ہے۔

اِس معاملے میں دوسری مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان 1947 میں بنا۔ اِس سے پہلے برصغیر ہند کا پورا علاقہ ایک واحد ملک کی حیثیت رکھتا تھا جس میں مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ آباد تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کے کچھ رہنماؤں نے متحدہ ہندستان میں دو قومی نظریہ (two nation theory) چلایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اُن کو اپنے مذہب کے مطابق، زندہ رہنے کے لیے ایک الگ ملک چاہیے۔ یہ تحریک اِس مفروضے پر قائم تھی کہ مسلم قوم کے نام سے ایک امت آل ریڈی موجود ہے، اب صرف اُس کو ایک علاحدہ خطہ ارض کی ضرورت ہے۔ اُس زمانے میں ایک مسلم شاعر کا یہ شعر بہت مقبول ہوا:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

جان و مال کی بے پناہ قربانی کے بعد 1947 میں جغرافی معنوں میں پاکستان وجود میں آ گیا، مگر معنوی اعتبار سے، پاکستان کا اب تک کوئی وجود نہیں۔ پاکستان میں نہ اسلام آیا اور نہ وہاں کے

مسلمانوں کو امن اور تحفظ حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج انڈیا کے مسلمان، اسلام اور امن وتحفظ دونوں اعتبار سے، پاکستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1971 سے پہلے انڈیا کے مسلمان، پاکستان جانے کے لیے بے تاب رہتے تھے، مگر آج انڈیا کا کوئی مسلمان، پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انڈیا میں وہ پاکستانی مسلمانوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے زیادہ بہتر حالت میں ہے۔

پاکستان بننے کے اول دن ہی سے وہاں باہمی ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کو گولی ماردی گئی۔ پاکستان کے مسلمانوں میں جو باہمی لڑائی شروع ہوئی، اس میں اب تک تقریباً 40 ہزار آدمی ہلاک ہوچکے ہیں۔ امریکا میں ایک آزاد تنظیم ہے۔ اس کا نام — فنڈ فار پیس (Fund for Peace) ہے۔ اِس تنظیم کا ایک کام یہ ہے کہ وہ ملکوں کے حالات کا سالانہ انڈیکس تیار کرتی ہے۔ اِس تنظیم نے 2011 میں ملکوں کا جو انڈیکس شائع کیا ہے، اس کے مطابق، پاکستان ایک ناکام ریاست (failed state) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اِس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے یہ فرض کرلیا کہ امتِ مسلمہ عملاً موجود ہے، اب صرف یہ ضرورت ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہوجائے، جب کہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، امتِ مسلمہ کا وجود ہی نہ تھا۔ جو چیز موجود تھی، وہ امت کے نام پر صرف ایک انبوہ تھا۔ ایسی حالت میں کام کا آغاز افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ امت کو وجود میں لانا تھا۔ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا، وہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا (putting the cart before the horse) تھا۔ اِس قسم کا غیر فطری منصوبہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، اور پاکستان کے معاملے میں ایسا ہی ہوا۔

فلسطین کی تحریک میں تمام عرب دنیا براہِ راست طور پر اور بقیہ مسلم دنیا بالواسطہ طور پر شریک ہے، مگر بے پناہ قربانیوں کے باوجود ابھی تک ایسا نہیں ہوا کہ فلسطین میں عربوں کی مطلوب حکومت قائم ہوجائے۔ لیکن جہاں تک سبق کا تعلق ہے، وہ فلسطین کی مثال میں بھی پوری طرح موجود ہے۔

فلسطین میں اگر بالفرض عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو عملاً وہ بھی ایک ناکام ریاست ہی ثابت ہوگی، کیوں کہ فلسطینی عرب بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح صرف ایک انبوہ ہیں، نہ کہ تیارشدہ افراد۔ ایسی حالت میں بالفرض اگر فلسطین میں عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو فلسطین میں عملاً وہی ہوگا جو دوسرے عرب ملکوں میں ہورہا ہے، یعنی یا تو سخت قسم کی ڈکٹیٹرشپ (dictatorship)، یا اگر بالفرض آزادی کا ماحول ہوتو خود فلسطینی مسلمانوں کے درمیان سخت قسم کی باہمی جنگ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی محفوظ طریقہ باقی ہے، اور وہ ہے— اسٹیٹس کوازم کا طریقہ، یعنی حالتِ موجودہ کو یک طرفہ طور پر تسلیم کرلینا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر نفرت اور تشدد کا طریقہ ختم کردیں۔ وہ اقدام کی نوعیت کی تمام سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کردیں۔ وہ یوٹرن (U turn) لیتے ہوئے اپنے عمل کے میدان کو بدل دیں۔ وہ دوسروں سے ٹکراؤ کے بجائے خود اپنے افراد کی تعلیم وتربیت کی طرف لوٹ آئیں۔ وہ اپنی تمام طاقت کو ''اقدام'' کے بجائے ''تیاری'' پر مرتکز کردیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے زندگی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اِس کے سوا جو کچھ ہے، وہ صرف ہلاکت ہے، نہ کہ زندگی۔

خدا اور پیغمبر

پاکستان کے قدرت اللہ شہاب (وفات: 1986) نے اپنی ضخیم کتاب ''شہاب نامہ'' میں اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''آبادی سے دور ایک مخبوط الحواس، مجنون صفت، مجذوب نما شخص ویرانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ہمہ وقت اِلّا اللہ، اِلّا اللہ کی ضربیں لگا تا رہتا تھا۔ میں اور میرا ایک ہم عمر ہندو دوست اکثر اس کے پاس جا کر اس کا منھ چِڑایا کرتے اور اس کے ذکر کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ میرا ہندو دوست اِلّا اللہ کے وزن پر مہمل، مضحکہ خیز اور کبھی کبھی فحش قافیے جوڑ کر مذاق بھی اڑایا کرتا تھا۔ مجذوب نے ہمیں بار بار ڈانٹا کہ ہم اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کریں، لیکن ہم باز نہ آئے۔ ایک روز ہم دونوں اِسی مشغلے میں مصروف تھے کہ ایک شخص اُدھر سے چند نعتیہ اشعار الاپتا ہوا گزرا، جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

محمدؐ نہ ہوتے، تو دنیا نہ ہوتی

یہ مصرع سن کر میرا ہندو دوست زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور اس نے اسمِ محمدؐ کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر ایک پتھر اٹھایا، اور اسے گھما کر ہندو لڑکے کے منہ پر ایسے زور سے دے مارا کہ اس کا سامنے کا آدھا دانت ٹوٹ گیا۔

لاشعور کی وہ کون سی لہر تھی جو اللہ کے ساتھ مذاق پر تو خاموش رہتی تھی، لیکن رسول اللہ کے ساتھ گستاخی پر آناً فاناً جوش میں آگئی تھی؟ کوئی شخص رسول خدا کے متعلق بدزبانی کرے تو اکثر لوگ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور کچھ لوگ تو مرنے مارنے کی بازی تک لگا بیٹھتے ہیں۔ اس میں اچھے، نیم اچھے یا برے مسلمان کی بالکل کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تجربہ تو یہی شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ناموسِ رسول پر اپنی جانِ عزیز کو قربان کردیا، ظاہری طور پر نہ تو وہ علم وفضل میں نمایاں تھے اور نہ زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے۔ ایک عامی مسلمان کا شعور اور لاشعور جس شدت

اور دیوانگی کے ساتھ شانِ رسالت کے حق میں مضطرب ہوتا ہے، اس کی بنیاد عقیدے سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔خواص میں یہ عقیدت ایک جذبہ اور عوام میں ایک جنون کی صورت میں نمودار ہوتی ہے‘‘۔(شہاب نامہ، لاہور، 1988، صفحہ 17۔16)

قدرت اللہ شہاب نے جو بات کہی ہے، وہ بلاشبہہ ایک واقعہ ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام مسلمان، غالباً کسی استثنا کے بغیر، اِسی نفسیات کا شکار ہیں۔خدا کی بے حرمتی ہو تو مسلمانوں کے جذبات نہیں بھڑکتے، لیکن رسول کی بے حرمتی ہو تو تمام مسلمان شدید طور پر بھڑک اٹھتے ہیں۔فتوے اور بیانات سے لے کر عوامی مظاہرے تک وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔اِس معاملے میں ان کی جذباتیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ تشدد اور توڑ پھوڑ تک کو اپنے لیے جائز سمجھ لیتے ہیں۔اِس معاملے کی مثالیں بار بار میڈیا میں آتی رہتی ہیں۔اِس کی ایک مثال وہ ہے جو ماہ نامہ الرسالہ (دسمبر 2012، صفحہ 25) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خدا اور رسول کے درمیان اِس فرق کا سبب کیا ہے۔اِس کے سبب کی تحقیق کیجیے تو اِس کے پیچھے مسلمانوں کی ایک ایسی کمزوری کی دریافت ہوتی ہے جو صرف ایک کمزوری نہیں، بلکہ وہ یقینی طور پر ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا کا عقیدہ

خدا کے خلاف لکھنے اور بولنے والے پہلے بھی دنیا میں پائے جاتے تھے، لیکن موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔فریڈرک نٹشے (Friedrich Nietzsche) مشہور جرمن فلسفی ہے۔56 سال کی عمر میں 1900 میں اس کی وفات ہوئی۔جدید فلسفے میں اس کا بہت بڑا درجہ مانا جاتا ہے۔نٹشے نے کھلے طور پر کہا تھا کہ — خدا مر چکا ہے:

God is dead. (EB. 13/79)

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) دورِ جدید کا مشہور ترین جرمن سائنس داں ہے۔76 سال کی عمر میں 1955 میں اس کی وفات ہوئی۔خدا کے بارے میں آئن سٹائن کے خیالات کیا تھے،

اس کا اظہار آئن سٹائن کے ایک مطبوعہ خط سے ہوتا ہے۔ یہ خط اس نے 3 جنوری 1954 کو اپنی ہینڈ رائٹنگ میں جرمن زبان میں ایک یہودی فلاسفر ایرک بی گٹ کائنڈ (Eric B. Gutkind) کے نام لکھا تھا۔ اِس خط میں اس نے لکھا تھا کہ — خدا کا لفظ میرے نزدیک اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کا ایک اظہار ہے:

The word God is for me nothing more than
the expression of human weaknesses.

موجودہ زمانے میں خدا کے عقیدے کے خلاف جو کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو مقالات شائع ہوئے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہے۔ اِس نوعیت کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

God: The Failed Hypothesis, by Victor Stenger, 2007
Society without God, by Phil Zuckerman, 2008
God is not Great, by Christopher Hitchens, 2009

انٹرنیٹ پر اِس نوعیت کی کئی مستقل ویب سائٹس ہیں۔ مثلاً:

God is Imaginary, God Does not Exist

اِس سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا علمی موضوع سائنس ہے۔ سائنس کو موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ طاقت ور علمی موضوع سمجھا جاتا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ سائنس کے تمام شعبوں سے خدا کو مکمل طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ سائنس بظاہر تخلیق (creation) کے مطالعے کا نام ہے، مگر سائنس کی تمام شاخوں میں خالق (Creator) کو پوری طرح حذف کر دیا گیا ہے۔ اِس کی آخری حد یہ ہے کہ خود سائنس کے مطالعے سے موجودہ زمانے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ کائنات میں واضح طور پر ایک ذہین ڈیزائنر (intelligent designer) پایا جاتا ہے۔

یہ دریافت اپنے آپ میں ثابت کرتی ہے کہ یقینی طور پر کائنات کے پیچھے ایک ذہین ڈیزائنر موجود ہے۔ اِس کے باوجود سائنٹفک کمیونٹی (scientific community) خدا کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

خدا اور مسلمان

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ علم اور کلچر دونوں اعتبار سے، ایک خدا ناشناس زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے کا کیس صرف یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتا، بلکہ وہ کھلے طور پر خدا کے عقیدے کا استہزا کرتا ہے۔ وہ کھلے طور پر اُس مذموم روش میں مبتلا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے ''خدا کی شان میں گستاخی'' کا لفظ بھی ہلکا ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے کوئی شدید تر لفظ وضع کرنا پڑے گا۔ یہ سب کچھ کسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانے کی لائبریریوں میں ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جو خدا کے بارے میں اُس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہیں جس کی مثال سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسیس (The Satanic Verses) میں پائی جاتی ہے۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ اِس سے کم تر درجے کے کیس میں مسلمانوں کی حمیتِ رسول آخری حد تک بھڑک اٹھتی ہے، جب کہ خدا کے معاملے میں ان کی حمیت نہیں بھڑکتی۔

مثال کے طور پر ستمبر۔نومبر 2012 میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر امریکی فلم (Innocence of Muslims) کے خلاف احتجاج (protest) کیا۔ یہ احتجاج مصر سے لے کر آسٹریلیا تک، بہت سے شہروں میں کیا گیا۔ اِس میں ہر جگہ مسلمانوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ کئی جگہ اِس احتجاج نے تشدد اور توڑ پھوڑ کی صورت اختیار کر لی۔ میڈیا کی رپورٹ کے مطابق، اِس احتجاج میں تقریباً 80 لوگ مارے گئے اور ایک سو سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ اِس درمیان پراپرٹی کا جو نقصان ہوا، وہ اس کے علاوہ ہے۔

نفسیاتی تجزیہ

یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اِس کے پیچھے مسلمانوں کی ایک مجرمانہ نفسیات پائی جاتی ہے۔ یہ وہی نفسیات ہے جو مشرکین کے بارے میں قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (6:136) یعنی خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، اُس میں سے اُنھوں نے خدا کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ پس، اپنے گمان کے مطابق، وہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا۔ پھر جو حصہ اُن کے شریکوں کا ہوتا ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے، وہ اُن کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

لوگ اللہ اور اپنے شرکا کے درمیان جو تفریق کرتے تھے، وہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اِس کا سبب دراصل اُن کے غلط مفروضات تھے۔ انھوں نے بطور خود یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ اُن کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے، وہ ان کے شرکا کی برکت سے ملتا ہے۔ اِس خودساختہ عقیدے کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ اصل مسئلہ شرکا کو خوش رکھنے کا ہے۔ اگر شرکا خوش رہیں گے تو ان کے سارے معاملات درست رہیں گے۔ اِس عقیدے کی بنا پر وہ شرکا کے حصے کو تو پورا کر دیتے تھے اور خدا کا حصہ کم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلمانوں کا ایک اور اعتبار سے ہے۔ صحابہ اور تابعین کے بعد مسلمانوں میں جو ذہن بنا، اُس ذہن کے تحت مسلمانوں نے خودساختہ طور پر یہ کیا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کو سب سے بڑا درجہ دے دیا۔ انھوں نے اپنے پیغمبر کا درجہ اتنا بڑھایا کہ خدا اُن کے لیے عملاً صرف ایک رسمی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ دورِ تصنیف میں مسلمانوں کے لکھنے والوں نے پیغمبر کی عظمت پر ہزاروں کتابیں لکھیں، لیکن وہ اللہ کی عظمت پر کوئی قابلِ ذکر کتاب نہ لکھ سکے۔

بعد کے زمانے میں یہ ہوا کہ مسلمانوں کے پاس جتنے بڑے بڑے القاب تھے، وہ سب انھوں نے اپنے پیغمبر کو دے دیے۔ مثلاً سرورِ عالم، شہنشاہِ کونین، تاج دارِ دو عالم، سید الکونین، وغیرہ۔ اِس قسم کے بڑے بڑے القاب جب پیغمبر کو دے دئے جائیں تو اس کے بعد انسانی الفاظ میں، اللہ کو دینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ اللہ کا تصور ایک باعظمت تصور کی حیثیت سے شعوری طور پر مسلمانوں کے ذہن میں باقی نہیں رہا۔ یہی وہ ذہن ہے جس کی نمائندگی

ایک مسلم شاعر نے اِن الفاظ میں کی ہے:

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے　　جو کچھ ہمیں لینا ہے، لے لیں گے محمد سے

اسلام کی تاریخ

اپنے پیغمبر کے بارے میں بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنا، اس کا ایک سیاسی پس منظر تھا۔ اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استثنائی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عظیم تاریخ آپ کے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ آپ کے زمانے میں اور آپ کے اصحاب کے زمانے میں ایک بڑا سیاسی انقلاب پیش آیا۔ اِس سے پہلے کسی پیغمبر کے زمانے میں اِس قسم کا سیاسی انقلاب پیش نہیں آیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا موحدانہ مشن شروع کیا، جب کہ اُس وقت آپ ایک فردِ واحد کی حیثیت رکھتے تھے، مگر 23 سال کے بعد جب 632 عیسوی میں آپ کی وفات ہوئی تو پورا عرب آپ کے دین کا پیرو بن چکا تھا۔ اُس کے بعد آپ کے اصحاب نے آپ کے مشن کو جاری رکھا، یہاں تک کہ اگلے 25 سال کے دوران عرب کے اطراف کے بیش تر ممالک میں آپ کے پیروؤں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ کی بعثت کے 100 سال کے اندر یہ ہوا کہ آپ کے ماننے والوں نے ایک عظیم مسلم ایمپائر قائم کرلیا، جس کا دبدبہ کم وبیش ہزار سال تک باقی رہا۔

یہ سیاسی انقلاب اتنا زیادہ واضح تھا کہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک امریکی مصنف جان ڈرنک واٹر (وفات: 1937) نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — وہ عالمی تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز انسان کی حیثیت رکھتے ہیں:

One of the most remarkable men in history of the world. (*The Outline of Literature* by John Drinkwater, 1923)

انڈیا کے ایک مشہور اسکالر ایم این رائے (وفات: 1954) نے پیغمبر اسلام اور آپ کے بعد بننے والی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — محمد کا اِس حیثیت سے اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ تمام پیغمبروں میں سب سے بڑے پیغمبر تھے۔ اسلام کی توسیع تمام معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے:

Muhammad must be recognised as by far the greatest of all prophets. The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (*The Historical Role of Islam,* by M. N. Roy, 1939, p. 4)

امریکی مصنف ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انھوں نے انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے افراد کا ذکر کیا ہے جنھوں نے تاریخ میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اِس فہرست میں انھوں نے پیغمبر اسلام کو نمبر ایک پر رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ — آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور سیکولر سطح پر بھی:

Mohammad was the only man in history who was supremely successful on the religious and secular levels. (Dr. Michael H. Hart, *The 100,* 1978)

اِسی طرح، ایک امریکی اسکالر چارلس اساوی (وفات: 2000) نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے — یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، تو وہ شخص محمد تھے:

It does not seem too much to say that if any one man changed the course of history, that man was Muhammad. (*Muhammad's Historical Role,* by Charles Issawi, 1950, p. 95)

اِس طرح کے بہت سے سیکولر مصنفین اور غیر مسلم محققین ہیں جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہایت شان دار الفاظ میں کیا ہے۔ پیغمبر اسلام کے مشن کے ذریعے تاریخ میں جو انقلابی دور آیا، وہ اتنا عظیم تھا کہ تمام اہلِ علم نے اس کا اعتراف کیا، خواہ وہ سیکولر اہلِ علم ہوں یا

مذہبی اہلِ علم۔ انھوں نے کثرت سے اِس موضوع پر کتابیں لکھیں اور مقالات شائع کیے۔ مذکورہ چند اقتباسات اِس معاملے کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

خدا کا حصہ پیغمبر کو دینا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تحت جو عظیم تاریخ بنی، وہ تمام تر منصوبہ الٰہی کے تحت بنی۔ پیغمبر اسلام سے پہلے ہزاروں سال کے درمیان خدا کی طرف سے بہت سے پیغمبر آئے۔ اِن پیغمبروں کے زمانے میں توحید کا اعلان تو ہوا، لیکن توحید کی بنیاد پر کوئی اجتماعی انقلاب نہ آسکا، جب کہ اللہ تعالی کو مطلوب تھا کہ پیغمبر کے ذریعے ایک ایسا موحدانہ انقلاب برپا ہو جو شرک کے دور کو ختم کرے اور توحید کا دور دنیا میں لے کر آئے۔ آخر کار اللہ تعالی کی یہ منشا ہوئی کہ وہ تاریخ میں مداخلت کرے اور خصوصی نصرت کے ذریعے وہ انقلاب برپا کرے جو کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے تحت ضروری تھا۔ اللہ تعالی کے عام منصوبے کے مطابق، اِس منصوبے کی تکمیل اسباب کی صورت میں کی گئی۔ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس انقلاب کی بنیادی کڑی تھے۔

اللہ تعالی کے اِس خصوصی منصوبے کا آغاز چار ہزار سال پہلے حضرت ہاجرہ، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ہوا۔ اِس منصوبے کے تحت لمبی مدت کے دوران ایک خصوصی نسل تیار کی گئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِس نسل کی اعلی خصوصیات کی بنا پر ایک مستشرق نے اس کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا لقب دیا ہے۔ اِسی خصوصی نسل میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد اللہ کی برتر تدبیر کے تحت بہت سے موافق حالات ظہور میں آئے۔ یہ اپنے آغاز سے انجام تک، ایک انتہائی اعلی نوعیت کا خدائی منصوبہ تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعے جو عظیم اسلامی تاریخ بنی، وہ دراصل اِسی منصوبہ الٰہی کا نتیجہ تھی۔

قرآن میں اِس حقیقت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے زمانے میں جو تاریخی انقلاب آیا، وہ کسی فرد کا شخصی کارنامہ نہ تھا، بلکہ وہ براہِ راست طور پر اللہ کے ایک برتر منصوبے کا نتیجہ تھا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

بِاَفۡوَاهِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ -هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ (61:8-9) یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ یہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اللہ اس کو سب دینوں پر غالب کردے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِس حقیقت کو بار بار نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے مشن کے آغاز کے تقریباً 20 سال بعد مکہ فتح ہوا، جو کہ اُس وقت پورے عرب میں ہر اعتبار سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے وقت جب آپ فاتحانہ حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو احساسِ تواضع کے باعث آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی، حتی کہ لوگوں نے دیکھا کہ آپ کی داڑھی کجاوے کی لکڑی کو چھو رہی ہے۔ اُس وقت کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ نے جو خطبہ دیا، اُس میں یہ الفاظ تھے: لا إله إلا الله وحده، صدق وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 4547) یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اللہ نے اپنے بندے (محمد) کی نصرت کی اور اللہ نے دشمن کی جماعتوں کو تنہا شکست دے دی۔

حبِ شدید کا تعلق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو حبِ شدید (2:165) کا تعلق صرف اللہ سے ہوتا ہے، کسی اور سے نہیں۔ حُبّ کا مطلب ہے: اسٹرانگ افکشن (strong affection)، یعنی شدید قلبی تعلق۔ بعد کے دور کے مسلمانوں کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ جذباتی طور پر اُن کے لیے حب شدید کا مرکز اللہ کے بجائے پیغمبر بن گیا۔ اِس طرح اُن کے جذبات کا مرجع بدل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کی اہانت پر مشتعل نہیں ہوتے، لیکن وہ اپنے پیغمبر کی اہانت پر سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، انھوں نے مشرکین کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے یہ کیا کہ اللہ کے کارنامے کو اپنے پیغمبر کا کارنامہ

سمجھ لیا، جو کچھ اللہ کے لیے تھا، اس کو انھوں نے اپنے پیغمبر کے حصے میں ڈال دیا۔

سیرت اور تاریخ کی کتابیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیرت اور تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ فخر کی نفسیات کے تحت لکھی گئیں۔ سیرتِ رسول کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا عنوان غزواتِ رسول (مغازی) بن گیا، اور تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابوں کا عنوان شاہ نامہ اسلام اور فتوح البلدان قرار پایا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ سیرتِ رسول اور تاریخ اسلام کی کتابوں میں خدا کا عامل (divine factor) حذف ہوگیا۔ اسلام کی تاریخ عام طرز کی انسانی تاریخ بن گئی، وہ خدائی تاریخ نہ بن سکی۔ جب کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے، سیرتِ رسول اور اسلامی تاریخ دونوں میں اللہ کا خصوصی منصوبہ کارفرما تھا۔

سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کا یہی غیر واقعی طریقہ بعد کے زمانے کے مسلمانوں میں رائج ہوگیا۔ اُس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنا، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تھا کہ انھوں نے تاریخ کی تمام عظمتوں کو اپنے پیغمبر کے خانے میں ڈال دیا، جو چیز اصلاً خدا کا حصہ تھی، وہ پیغمبر کا حصہ قرار پائی۔ اِس کے بعد مسلمانوں کے اندر جو نفسیات بنی، وہ فطری طور پر یہ تھی کہ اُن کو تمام بڑائی اپنے پیغمبر کی طرف دکھائی دینے لگی، مسلمانوں کے اپنے ذہن کے مطابق، اللہ کے حصے میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔

منصوبۂ خداوندی

بارش کے موسم میں بارش ہوتو یہ اِس بات کا ایک خاموش اعلان ہوتا ہے کہ کسان اٹھیں اوراپنے کھیتوں میں کام کرکے اُن میں بیج ڈالیں، تاکہ کھیتوں سے سرسبز وشاداب فصل اگے۔ لیکن کسان اگرایسا کرے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر پہاڑ کی طرف جائے اور وہاں وہ کوہ پیائی (mountaineering) کرنے لگے۔ کوئی انسان اگرایسا کرے تو کوششوں اورقربانیوں کے باوجود وہ کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکے گا، کیوں کہ وہ خالق کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کے معاملہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے امکانات کھولے جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا کام ہوتا ہے کہ وہ اِن امکانات کو پہچانیں اوراُن کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کریں۔ اگراہلِ ایمان ایسا کریں کہ اللہ نے امکانات تو کہیں اور کھولے ہوں، لیکن اہلِ ایمان کسی دوسرے محاذ پر کوشش شروع کردیں۔ اہلِ ایمان اگر ایسی غلطی کریں تو خواہ وہ کتنی ہی قربانیاں دیں، مگراس کا کوئی نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ قرآن کے الفاظ میں، **حبطت أعمالهم في الدنيا والآخرة** کا مصداق قرار پائیں گے۔

اِس دنیا میں کوئی بھی عمل صرف انسان کی کوشش سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اِس دنیا میں کسی عمل کی کامیابی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کو خدا کی تائید حاصل ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی عقل کا امتحان ہورہا ہے۔ خدا کی طرف سے جب بھی کوئی امکان کھولا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک خاموش امکان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کبھی آسمان سے آواز نہیں آتی، حتی کہ جب اِس دنیا میں خدا کا کوئی پیغمبر آتا ہے تو بلاشبہہ وہ خدا کا ایک خصوصی منصوبہ ہوتا ہے، لیکن اُس وقت بھی آسمان سے یہ آواز نہیں آتی کہ — اے لوگو، یہ خدا کا رسول ہے۔ اس کو سنو اوراس کا اتباع کرو۔ یہ ایک دریافت کا معاملہ ہے جوانسان کو اپنی عقل کے استعمال کے ذریعے خود کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اِس معاملے میں

مکمل طور پر ناکام رہے۔ موجودہ زمانے میں خدا نے انتہائی اعلیٰ قسم کے دینی مواقع کھول دئے ہیں، لیکن مسلم رہنما، خواہ وہ عرب رہنما ہوں یا غیر عرب رہنما، سب کے سب اِس معاملے میں بے خبر رہے۔ وہ خدا کی اسکیم کے خلاف کسی اور میدان میں زور آزمائی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 200 سال سے بھی زیادہ مدت تک جان و مال کی قربانیاں دینے کے باوجود اُنھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

خدا کا مقصود کیا ہے

خدا کے نزدیک کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو خدا کے منصوبۂ تخلیق سے باخبر کیا جائے۔ اِسی مقصد کے لیے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے، اور اِسی مقصد کے لیے آخر میں قرآن بھیجا اور اس کے متن (text) کو مکمل طور پر محفوظ کردیا۔ قرآن اِس تخلیقی منصوبے کا ایک مستند بیان (authentic statement) ہے۔ اب ضرورت ہے کہ یہ خدائی بیان ہر دور کے انسانوں تک پہنچتا رہے۔ اِسی عمل کا نام دعوت الی اللہ ہے۔

مقامی دعوت سے عالمی دعوت تک

پچھلے زمانوں میں جن داعیوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا، ان کا کام مقامی دائرے تک محدود رہا۔ دعوت کا کام ہمیشہ وسائل کی مدد سے ہوتا ہے اور پچھلے زمانے میں عالمی وسائل نہ ہونے کی بنا پر زیادہ وسیع دائرہ میں کام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انسانی آبادی پورے کرہ ارض پر پھیلی ہوئی تھی، لیکن پچھلے زمانے کے داعیوں کا دعوتی کام وسائل کے فقدان کی وجہ سے عملاً مقامی دائرے تک محدود رہا۔

تائید کا انتظام

اللہ تعالیٰ نے عالمِ فطرت (nature) کے اندر بالقوہ (potential) طور پر ایسے امکانات رکھے تھے جن کو دریافت کرکے اہلِ ایمان عالمی دائرے میں اپنے دعوتی عمل کو انجام دے سکیں۔ یہ امکان بنیادی طور پر وہ تھا جس کو کمیونکیشن (communication) کہا جاتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کو موجودہ زمانے میں ماڈرن کمیونکیشن (modern communication) کہا جاتا ہے، وہ فطرت کے امکانات کو دریافت کرکے ہی وجود میں آئے ہیں — پرنٹنگ پریس، تیز رفتار سواریاں اور

ملٹی میڈیا، سب کا سب، عالم فطرت کے امکانات کو دریافت کرکے تیار کیا گیا ہے۔ یہ تمام مواصلاتی ذرائع اِسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ اہلِ ایمان اُن کو بھر پور طور پر استعمال کریں اور اللہ کے پیغام کو پرامن طور پر تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔

موجودہ مسلمانوں کی ناکامی

اسلام کے ظہور کے بعد اللہ تعالی نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار عطا کیا۔ یہ سیاسی اقتدار ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ اِس اقتدار کا مقصد حکومت یا عیش وعشرت نہیں تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان بے خوف ہوکر فطرت (nature) کی تحقیق کریں اور فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کرکے وہ مواصلاتی وسائل تیار کریں جن کے ذریعے سے دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی طور پر انجام دیا جاسکے۔

اِس معاملے میں اللہ تعالی نے ایسے اشارے کردئے تھے جو مسلمانوں کے لیے اپنے رول کو سمجھنے کے لیے کافی ہوسکتے تھے، مگر مسلمان اشارے کی زبان کو سمجھ نہ سکے۔ مثلاً قرآن میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کی تمام چیزیں تمھارے لیے مسخر کردی گئی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کی تخلیق اِس طرح ہوئی ہے کہ انسان اُس میں غور وفکر کرکے اس کے اندر چھپے ہوئے موافق امکانات کو دریافت کرے اور اُن کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ وہ چیز جس کو آج مواصلاتی ٹکنالوجی کہا جاتا ہے، وہ سب اِس کے اندر شامل ہے۔

دوسرا اہم اشارہ وہ ہے جو اسراء کے واقعے کی صورت میں پیش آیا۔ مکی دور کے آخر میں یہ واقعہ ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی انتظام کے تحت ایک رات کے اندر مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصی (یروشلم) لے جایا گیا اور پھر واپس اپنے مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اِس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الاسراء (17) میں کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ مکہ اور یروشلم کے درمیان تقریباً 1250 کلومیٹر کا فاصلہ ہے، یعنی رٹرن جرنی (return journey) کے اعتبار سے 2500 کلومیٹر کا فاصلہ۔

قرآن کی جس سورہ میں اِس واقعے کا ذکر ہے، اس میں مقصدِ سفر کو اِن الفاظ میں

بیان کیا گیا ہے: لنریہ من آیاتنا (17:1) یعنی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں:

So that We might show him some of Our signs.

اِس آیت میں جس نشانی کا ذکر ہے، اس سے مراد خود سفر ہے، نہ کہ یروشلم میں واقع کوئی چیز۔ اللہ تعالی نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعے جو کتاب ہدایت (قرآن) بھیجی، وہ اِس لیے تھی تاکہ وہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچے۔ یہ عالمی پیغام رسانی کیوں کر ممکن ہوگی، اس کے بارے میں اشاراتی طور پر بتایا گیا کہ عالمِ فطرت (nature) میں اللہ نے بالقوہ طور پر تیز رفتار ترسیل (rapid communication) کے امکانات رکھ دئے ہیں جن کو دریافت کرکے واقعہ بناؤ اور اُن کو تمام اہلِ عالم تک پیغام خداوندی (قرآن) کو پہنچانے کے لیے استعمال کرو۔

استبدالِ قوم کا اصول

امتِ مسلمہ کو اللہ تعالی نے لمبی مدت تک یہ موقع دیا کہ وہ فطرت کے اِس امکان کو واقعہ بنائے اور قرآن کے سلسلے میں اپنی عالمی ذمے داری کو پورا کرے، لیکن امتِ مسلمہ کے رہنما اور قائدین اِس راز کو نہ سمجھ سکے۔ وہ دوسرے میدانوں میں سرگرم رہے، لیکن دعوت الی اللہ کے عالمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو عمل مطلوب تھا، اُس عمل کو انجام دینے میں وہ پوری طرح ناکام رہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالی کی وہ سنت ظاہر ہوئی جس کو قرآن میں استبدالِ قوم (47:38) کہا گیا ہے، یعنی ایک خدائی مطلوب کو انجام دینے میں اگر ایک گروہ ناکام ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے گروہ کو لے آنا — موجودہ زمانے میں جن مغربی قوموں نے دورِ مواصلات (age of communication) پیدا کیا ہے، وہ اِسی استبدالِ قوم کی توسیعی صورت ہے۔

تائید بذریعہ سیکولر اقوام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی پیشین گوئیاں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062) یعنی اللہ یقیناً اِس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے کرے گا۔

اِس حدیث میں ’فاجر‘ سے مراد سیکولر ہے۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب امتِ مسلمہ دعوتِ دین کے عالمی ذرائع کو دریافت کرنے میں ناکام ہوجائے گی تو اُس وقت اللہ تعالیٰ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو اِس کام کو انجام دیں، یعنی جب دینی محرک (religious incentive) اِس کام کو انجام دینے میں ناکام ہوجائے گا تو اللہ کچھ لوگوں کو دنیوی محرک (secular incentive) کے ذریعہ اٹھائے گا۔ وہ فطرت میں تحقیق وجستجو کے ذریعے فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو واقعہ بنائیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی طرف سے امتِ مسلمہ کے لیے ایک سپورٹنگ رول ہوگا۔

موجودہ زمانے میں، خاص طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں، اہلِ مغرب نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو دریافتیں کی ہیں، وہ سب اِسی نوعیت کی ہیں۔ اِن دریافتوں کے ذریعے اللہ تعالی نے اپنے دعوتی مشن کو انجام دینے کے لیے ایک خارجی سپورٹ کا انتظام کیا ہے۔

ملی رہنماؤں کی ناکامی

اہلِ مغرب نے تائید کا جو کام انجام دیا، اُس کے پیچھے کوئی دینی جذبہ نہیں تھا۔ یہ کام انھوں نے اپنے مادی اور قومی جذبے کے تحت کیا۔ یہ بالکل فطری تھا۔ اِس قسم کے ذاتی محرک کے بغیر وہ خارجی سپورٹ فراہم کرنے کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ مزید یہ کہ جب انھوں نے اتنا بڑا تاریخی کام انجام دیا تو یہ بھی فطری تھا کہ اُن کو عالمی دبدبہ حاصل ہوجائے۔ کسی بڑے رول کے ساتھ دبدبہ اِس طرح جڑا ہوا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اِس کے ذریعے اُن کو نہ صرف مادی فائدے حاصل ہوئے، بلکہ اُن کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی غلبہ بھی حاصل ہوگیا۔ یہ اُن کے سپورٹنگ رول کی قیمت تھی۔ اِس قیمت کے بغیر وہ اپنا سپورٹنگ رول انجام نہیں دے سکتے تھے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرنے میں عاجز رہے۔ وہ اِس حکمت (wisdom) کا ثبوت نہ دے سکے جس کو اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ — متعلق حصے کو لینا اور غیر تعلق حصے کو چھوڑ دینا۔

مغربی قومیں جب جدید طاقتوں کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں تو اِس داخلے کے

دو پہلو تھے — ایک، یہ کہ اِن مغربی قوموں نے فطری طور پر اُس وقت کی مسلم دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل کرلیا۔ اِس واقعے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ قومیں اُس عظیم نعمت کو لے کر آئی تھیں جو خود اسلام کا عین مطلوب تھا، جس کا ہزار سال سے تاریخ کو انتظار تھا، یعنی جدید مواصلات (modern communication)۔مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنما بروقت اُس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے جو اُس وقت اُن سے مطلوب تھی، یعنی سیاسی مسئلے کو عملی طور پر نظرانداز کرنا اور کمیونکیشن کے جدید ذرائع کو بھرپور طور پر دعوت کے لیے استعمال کرنا۔موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام مسائل اِسی دانش مندی کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

ایک عرب شیخ عبدالرحمن حبنکہ المیدانی نے اپنی ایک کتاب میں بتایا ہے کہ اِس وقت امتِ مسلمہ کے تمام مسائل کا اصل سبب تین اژدہے ہیں ۔مصنف کے نزدیک، یہ تین اژدہے یا یہ تین بڑے سانپ یہ ہیں— استعمار (colonialism)، استشراق (orientalism)، مسیحی مبلغین(Christian missionaries)۔ یہ کسی ایک مصنف کی بات نہیں، یہی موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کی سوچ ہے۔ اسی غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان پچھلے 200 سال سے اِن مفروضہ ’’افاعی‘‘ سے لڑنے اور ان کو ختم کرنے میں مشغول ہیں،لیکن عملی نتیجہ مکمل طور پر برعکس صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ’’افاعی‘‘ اپنی حقیقت کے اعتبار سے افاعی نہ تھے، بلکہ مذکورہ حدیثِ رسول کے مطابق، وہ مویدینِ اسلام(supporters of Islam) کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے موجودہ زمانے میں وہ چیز وجود میں آئی جس کو جدید مواصلات کہا جاتا ہے۔جدید مواصلات کو انھوں نے اپنے مقصد کے لیے ڈیولپ کیا تھا،لیکن جدید مواصلات، عالمی مواصلات ہیں،اُن پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔اگر مسلم علما اور رہنما صرف یہ کرتے کہ وہ اِن مفروضہ افاعی کے خلاف ٹکراؤ کا محاذ نہ کھولتے اور پُرامن طریقِ کار اختیار کرتے تو بلاشبہہ وہ جدید مواصلات کو کامل طور پر اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے اور اسلام کی عالمی دعوت کے اُس منصوبے کو پورا کرسکتے تھے،

جس کا تاریخ کو ہزار سال سے انتظار ہے۔

ایک تاریخی حوالہ

پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (Thomas Walker Arnold) ایک ممتاز برٹش مستشرق (orientalist) تھے۔ وہ 1864 میں لندن میں پیدا ہوئے اور 1930 میں اُن کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اسلامی دعوت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب 508 صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1896 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Preaching of Islam

اِس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بعد کے ہزار سال تک مختلف ملکوں میں اسلام کی دعوت کس طرح پھیلی۔ مثال کے طور پر افریقہ کے بارے میں انھوں نے ایک رپورٹ کے حوالے سے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ — اِس وقت جس رفتار سے افریقہ میں اسلام پھیل رہا ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نائجر دریا کے دونوں کناروں پر 1910 تک مشکل ہی سے کوئی گاؤں بچے گا جو اسلام کے حلقے میں نہ آ گیا ہو:

> A Christian missionary reports: "When I came out in 1898, there were few Muhammadans to be seen below Iddah. Now they are everywhere, excepting below Abo, and at the present rate of progress there will scarcely be a heathen village on the river (Niger) banks by 1910." (p. 329)

پروفیسر آرنلڈ نے یہ بات مغربی افریقہ کے نائجر دریا کے دونوں طرف واقع بستیوں کے بارے میں لکھی ہے۔ واضح ہو کہ نائجر دریا تقریباً چار ہزار دو سو کلو میٹر (4, 180) لمبا ہے۔ وہ افریقہ کے پانچ ملکوں کے درمیان بہتا ہے، یعنی — گائنا (Guinea)، مالی (Mali)، نائجر (Niger) بینن (Benin)، نائجیریا (Nigeria)۔ اِسی مثال پر دوسرے ملکوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی دعوتی توسیع کا یہ عمل انیسویں صدی میں عین اُس وقت رک گیا، جب کہ پرنٹنگ پریس

اور جدید مواصلات کی آمد نے اسلامی دعوت کی عالمی توسیع کا امکان بڑے پیمانے پر کھول دیا تھا—
اِس کا سبب یہ تھا کہ انیسویں صدی میں جب یہ نئے امکانات کھلے تو عین اُسی زمانے میں ایک ''مسئلہ''
بھی پیدا ہو گیا، وہ یہ کہ مغربی تہذیب اور مغربی استعمار (Western Colonialism) نے
نئے طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے مسلم ملکوں میں اپنا دبدبہ قائم کرلیا۔

اُس وقت یہ ہوا کہ تمام دنیا کے مسلمان منفی ردعمل (negative reaction) میں مبتلا
ہو گئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور مغربی استعمار کے خلاف لڑائی کا محاذ کھول دیا۔ کچھ لوگ تقریر اور
تحریر کے ذریعے اِس قومی مہم میں شریک ہو گئے، اور کچھ لوگوں نے بطور خود اس کو جہاد قرار دے کر اس
کے خلاف مسلح جنگ چھیڑ دی۔

یہ صورتِ حال عملاً آج بھی باقی ہے۔ دعوت کے مواقع برباد ہو رہے ہیں اور مسلمان
انتہائی ناکام طور پر قومی اور سیاسی لڑائی میں مشغول ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ
ساری دنیا کے مسلمان ان تباہ کن سرگرمیوں کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ
دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہو جائیں۔

ربوبیت: کائنات میں ربانی تنظیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سارے عالم کا رب ہے (1:1)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کرکے اس کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ ہر لمحہ کائنات کو مینج کر رہا ہے، مادی کائنات کو بھی اور انسانی تاریخ کو بھی۔ مادی کائنات میں اللہ کا مینج مینٹ (management) کلی معنوں میں ہے، لیکن انسان کو چوں کہ انتخاب کی آزادی (freedom of choice) ملی ہوئی ہے، اِس لیے انسانی زندگی میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے، اس کو مینج کر رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر انسان اپنا امتحان دے رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو اِس طرح تعمیر کرے کہ وہ آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے جو کہ انسان کی اصل منزل ہے۔ اِس مصلحت کے تحت اللہ موجودہ دنیا کی مسلسل نگرانی کرتا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کو اِس طرح مینج کر رہا ہے کہ موجودہ زمین اپنے دار الامتحان (testing ground) ہونے کی حیثیت کو کسی خلل کے بغیر مسلسل طور پر برقرار رکھے۔ اِس کا مقصد زمین پر اجتماعی معنوں میں کوئی صالح نظام قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی انفرادی تعمیر کرنا چاہے، وہ کسی خلل کے بغیر اپنی شخصی تعمیر کرتا رہے۔

اللہ کی اِس سنت کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:251) یعنی اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جائے، مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے:

And if God did not check one set of people by means of another, the earth would indeed be full of mischief. But God is full of bounty to all worlds.

انسانی تاریخ کے بارے میں اللہ کا یہ منصوبہ بظاہر کسی اعلان کے بغیر اپنا کام کر رہا ہے۔ قرآن کی سورہ الکہف (18:60-82) میں موسیٰ اور خضر کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ اِسی مینج مینٹ کی ایک جزئی مثال ہیں۔ اِس میں جس کردار کو خضر کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک فرشتہ تھا، نہ کہ کوئی انسان۔

دوطرفہ انتظام

اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد ایک طرف یہ کیا کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جو ساتویں صدی عیسوی میں خاتم النبیین کے ظہور تک جاری رہا۔ یہ پیغمبر اس لیے آئے تاکہ انسان کو لفظی طور پر یہ بتادیا جائے کہ انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے، تاکہ جو انسان اِس تخلیقی منصوبے کے مطابق، زندگی گزارنا چاہے، وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرسکے۔ خاتم النبیین کے ذریعے اللہ کا جو کلام قرآن کی شکل میں آیا، وہ پوری طرح محفوظ ہوگیا، اور پرنٹنگ پریس کے دور میں ہر انسان تک اس کا مستند نسخہ پہنچ گیا۔ اِس لیے اب کسی پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں۔

اِس خدائی انتظام کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو تاریخ کا ربانی مینج مینٹ (divine-management of history) کہا جاسکتا ہے۔ اِس مینج مینٹ کا خاص حصہ یہ ہے کہ زمین پر کوئی فتنے کی حالت قائم نہ ہونے پائے۔ چناں چہ جب بھی زمین پر فتنے کی کوئی حالت قائم ہوتی ہے تو اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو اس کو ختم کردینے والے ہوں۔ موجودہ زمانے میں اِس قانونِ دفع کی ایک مثال یہ ہے کہ 1917 میں کمیونسٹ ایمپائر قائم ہوا۔ اس نے ایک بڑے رقبے میں خلافِ مذہب قانون بنا کر انسان سے چوائس (choice) کا حق چھین لیا۔ اُس وقت اللہ تعالی نے امریکا کو استعمال کیا اور تقریباً 75 سال کے بعد 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے تحت قائم شدہ جبری نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

امت مسلمہ کا رول

اِس خدائی منصوبے میں امتِ مسلمہ کا رول کیا ہونا چاہئے، اس کو قرآن میں اشارات کی زبان میں بتا دیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الصّف کی ایک آیت یہ ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (61:14) یعنی اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسی بن مریم نے حواریوں سے کہا: کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے

کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں، مدد کی، پس وہ غالب ہو گئے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک بہت اہم بات کہی گئی ہے۔ اِس آیت کا خطاب امتِ مسلمہ سے ہے، لیکن اِس میں امتِ مسیح کے ایک نمونے کو بطور ماڈل پیش کیا گیا ہے اور امتِ مسلمہ سے یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اُسی ماڈل کے مطابق کام کرو جس کے مطابق، امتِ مسیح نے کام کیا یا مستقبل میں کام کریں گے۔ یہ ماڈل آئڈیالوجی یا عقیدہ کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ صرف طریقِ کار (method) کے اعتبار سے ہے۔ اِس اعتبار سے، امتِ مسیح (Christian community) کے یہاں جو ماڈل ملتا ہے، اس کی دو تاریخی مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانے میں مسیحی گروہ، تعداد کے اعتبار سے، سب سے بڑا مذہبی گروہ بن جائے گا (صحیح مسلم، کتاب الفتن)۔ ایسا کیوں کر ہوگا، اس کا جواب بھی اِسی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

اِس معاملے کی پہلی مثال وہ ہے جو خود حضرت مسیح کے زمانے میں پیش آئی۔ حضرت مسیح کا مقامِ عمل قدیم فلسطین تھا۔ فلسطین میں حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں پر سخت ظلم کیا گیا، مگر حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق، اُن کے پیروؤں نے اپنے دشمنوں سے کوئی نفرت نہیں کی۔ انھوں نے دشمنوں کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی، حتی کہ ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ بھی نہیں کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ فلسطین سے باہر چلے گئے اور حضرت مسیح کی تعلیم: دشمن سے محبت کرو (love your enemy) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے پر امن دعوت (peaceful missionary work) میں مشغول ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سینٹ پال کے زیر اثر مسیحی گروہ کے اندر کچھ نظریاتی انحرافات پیدا ہوئے، لیکن جہاں تک پر امن طریقِ کار کا معاملہ ہے، اُس پر وہ بدستور پوری طرح قائم رہے۔ پر امن مشنری سرگرمیوں کے ذریعے مسیحیت مختلف ملکوں میں پھیلتی رہی، یہاں تک کہ رومی شہنشاہ کانسٹینٹین اول (Constantine I) نے 337 میں مسیحی مذہب قبول کرلیا۔ یہ الناس علی دین ملوکھم کا دور تھا۔ چناں چہ جلد ہی ایسا ہوا کہ یورپ کے تقریباً تمام باشندوں نے مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا، مسیحی گروہ کو

یہ غیر معمولی کامیابی تمام تر پر امن دعوت کے ذریعے حاصل ہوئی۔

مسیحی گروہ کے ذریعے تاریخ میں اس سلسلے میں دوسرا ماڈل ساتویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ ساتویں صدی میں مسلمانوں کو جب عروج ہوا تو انھوں نے رومن ایمپائر کو توڑ دیا اور اِس مسیحی سلطنت کے پورے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اِس علاقے میں مسیحی عقیدے کے مطابق، مقدس مقامات، شام اور فلسطین، بھی شامل تھے۔ بعد کے زمانے میں یورپ کے مسیحی بادشاہوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لے لیں۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے وہ جنگ چھیڑی جو تاریخ میں، صلیبی جنگ (Crusades) کے نام سے مشہور ہے۔ صلیبی جنگ وقفے وقفے سے تقریباً دوسو سال (1095-1291) تک جاری رہی۔ مورخ گبن کے الفاظ میں، اِس جنگ میں یورپ کی مسیحی قوموں کو ذلت آمیز شکست (humiliating defeat) ہوئی۔ مگر تاریخ کا یہ انوکھا معجزہ ہے کہ اِس شکست کے بعد مسیحی قوموں میں منفی ردّعمل (negative reaction) کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے یہ کیا کہ اپنے جذبے کو پُرامن عمل کی طرف ڈائورٹ (divert) کر دیا، یعنی مسلمانوں سے مسلح مقابلہ ختم کر کے علم وتحقیق کے میدان میں اپنی کوششوں کو صرف کرنا۔

ڈائورژن (diversion) کے اِس عمل کو ابتدائی زمانے میں، اسپریچول کروسیڈ (spiritual crusades) کہا گیا تھا۔ بعد کو وہ رفتہ رفتہ سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) میں تبدیل ہوگیا۔ اِس عمل میں اُس وقت چرچ رکاوٹ بن گیا تو انھوں نے سخت جدوجہد کے بعد چرچ کے اختیارات پر حد بندی قائم کردی، پھر 1929 میں چرچ کو ویٹکن (روم) کے محدود رقبے میں گویا ہاؤس اریسٹ (house arrest) کر دیا جس کا کُل رقبہ صرف 109 مربع ایکڑ ہے۔

اِس دور میں یورپ کے جن لوگوں نے سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) یا سائنسی ریسرچ کے میدان میں کام کیا، وہ تقریباً سب کے سب مسیحی افراد تھے۔ اِس سائنسی عمل میں بریک تھرو (breakthrough) اُس وقت آیا، جب کہ 1609 میں اٹلی کے فلکیاتی عالم گلیلیو (Galileo Galilei) نے ابتدائی دوربین تیار کی اور اس کے ذریعے خلا کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدے نے سائنس دانوں کے سامنے عمل کا ایک ایسا میدان کھول دیا جو نا قابل قیاس حد تک وسیع تھا۔ اُس وقت یورپی ذہن نے یہ جانا کہ ہم عالمِ صغیر میں جی رہے تھے، جب کہ یہاں عالمِ کبیر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس کے بعد یورپ کے مسیحی اہلِ علم پوری طرح سائنسی تحقیق کے میدان میں سرگرم ہو گئے، یہاں تک کہ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا کر دیا جس کو عام طور پر جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔

قابلِ تقلید ماڈل

قرآن کی سورہ الصّف میں پیروانِ مسیح کے اِس ماڈل کو اہلِ ایمان کے لیے قابلِ تقلید ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اِس سے مراد خاص طور پر پیروانِ مسیح کی تاریخ کے یہی دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ وہ ہے جو حضرت مسیح کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں پیش آیا، اُس وقت پیروانِ مسیح کو سخت طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس کے مقابلے میں ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ طریقہ اختیار کیا جو حضرت مسیح نے اُن کو اِن الفاظ میں بتایا تھا— اپنے دشمن سے محبت کرو۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی طرف سے اگر تم کو دشمنی کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنے آپ کو منفی نفسیات سے بچاؤ اور یک طرفہ طور پر پرامن طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسروں تک اپنا پیغام پہنچاؤ۔

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد سامنے آیا، یعنی عسکری میدان میں ناکامی کے بعد اپنے میدانِ عمل کو بدل دینا، جیسا کہ پیروانِ مسیح نے کیا۔ انھوں نے مسلح کروسیڈ کے میدان میں اپنی کوششوں کو بے نتیجہ پایا تو انھوں نے ڈائورژن کا طریقہ اختیار کیا، اِس طرح کہ عسکری میدان کو چھوڑ کر پرامن سائنسی میدان میں اپنے آپ کو سرگرمِ عمل کر لیا۔

امت مسلمہ کی کوتاہی

عجیب بات ہے کہ سورہ الصّف میں مسلمانوں کو جو عملی نصیحت کی گئی تھی، اس کو وہ اختیار نہ کر سکے۔ مسلمانوں سے یہ مطلوب تھا کہ وہ پیروانِ مسیح کے اُس ماڈل کو اپنائیں جس کو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا تھا۔ یہی وہ پرامن ماڈل ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے

موقع پر اختیار فرمایا تھا۔مگر مسلمان بحیثیت قوم اس سے بے خبر رہے، وہ اِس ماڈل کو اپنانے میں ناکام رہے۔مسلمانوں کی تاریخ میں اِس کی دو بڑی مثالیں موجود ہیں۔

پہلی مثال وہ ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں کے ظہور کے بعد پیش آئی۔اِس دور میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کی سلطنتوں کو توڑ دیا اور ان کے سیاسی دبدبے کو ختم کر دیا۔اس کے بعد مسلمان منفی ردِّعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔وہ نفرت اور انتقام اور تشدد میں مبتلا ہو کر رہ گئے، حالاں کہ قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل کے مطابق، انھیں یہ کرنا تھا کہ وہ پُرامن طریقِ کار اختیار کرتے، یعنی وہ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت میں آجاتے، جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھ کر اُن سے متشددانہ ٹکراؤ کر رہے تھے، اُن کو مدعو کا درجہ دے کر وہ ان کے اوپر پرامن دعوہ ورک شروع کر دیتے۔اگر مسلمان ایسا کرتے تو یقیناً اُن کے اوپر قرآن کے وہ الفاظ صادق آتے جو اِس سے پہلے پیروانِ مسیح کے اوپر صادق آچکے تھے، یعنی: فأيدنا الذين آمنوا على عدوّهم فأصبحوا ظاهرين (61:14)

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ تھا جو صلیبی جنگوں کے بعد ظہور میں آیا۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے اوپر پہلی بار فطرت کے قوانین (laws of nature) منکشف ہوئے اور جدید تہذیب وجود میں آئی جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔

اِس دوسرے معاملے میں بھی مسلمان پوری طرح ناکام ہو گئے۔قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل میں ان کے لیے یہ پیغام تھا کہ مغربی قوموں سے مقابلہ آرائی میں جب باعتبار نتیجہ وہ ناکام ہو جائیں تو وہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی (revision) کریں۔اِسی نظر ثانی کو قرآن میں اجتماعی توبہ (24:31) کہا گیا ہے۔نظر ثانی کا وہ عمل یہ تھا کہ مسلمان اپنی کوششوں کو ٹکراؤ کے میدان سے ہٹائیں اور وہ اپنے آپ کو پوری طرح تعمیری کام میں لگا دیں، مگر مسلمان نفرتِ مغرب میں اتنی شدت سے مبتلا ہوئے کہ ان کے اندر یہ تعمیری سوچ پیدا نہ ہو سکی۔

اگر مسلمان اپنی منفی نفسیات سے باہر آ کر مثبت انداز میں سوچتے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ مغرب کی مسیحی قوموں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ عین اُن کی اپنی موافقت میں ہے۔اِس کے نتیجے میں جو

جدید تہذیب وجود میں آئی ہے، اس نے مسلمانوں کے لیے خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے نئے وسیع تر دروازے کھول دئے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر فرمایا تھا کہ بعد کے دور میں اللہ تعالی کچھ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو دین کے حق میں تائیدی رول (supporting role) انجام دیں گے۔ مغرب کی مسیحی قوموں کا کارنامہ اسی قسم کا تائیدی کارنامہ تھا۔ اِس موقع پر مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ مغربی قوموں کے خلاف نفرت اور تشدد کی پالیسی کو مکمل طور پر ختم کردیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے اندر ایک نیا مثبت ذہن ابھرتا۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ مغربی قوموں نے ان کے لیے کتنا بڑا تائیدی کام انجام دیا ہے۔

اِس تائیدی کام کا ایک پہلو وہ ہے جس کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — عن قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ ان کے اوپر یہ آشکارا ہوجائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے (40:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں جن چیزوں کو آیات (signs) کہا گیا ہے، اُن سے مراد وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جو پہلی بار مغربی قوموں کے ذریعے انسان کے علم میں آئیں۔ یہ سائنسی دریافتیں بے شمار پہلوؤں سے اسلام اور دعوتِ اسلام کے لیے مفید اور معاون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں جو اسلامی انقلاب آیا تھا، وہ ایک پہلو سے تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا آغاز تھا۔ یہ عمل تدریجی طور پر اپنا کام کرتا رہا۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو انقلابات آئے، وہ سب اِسی تاریخی عمل کی تکمیل تھے۔ مثلاً افکار کے معاملے میں کھلا پن (intellectual openness)، مذہبی آزادی، تشدد کے طریقے کا بحیثیت اصول ختم ہوجانا، بادشاہت کے بجائے جمہوریت کا نظام، پرنٹنگ پریس کا دور، وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام تبدیلیاں جو مغربی تہذیب کے بعد دنیا میں آئیں، وہ سب خود اسلام کا مطلوب تھیں۔ اِن تبدیلیوں کے ذریعے یہ ممکن ہوگیا کہ اسلام کی صداقت کو خالص علمی اعتبار سے مدلّل کیا جائے۔ جدید ٹکنالوجی اور کمیونکیشن نے اِس بات کو ممکن بنادیا کہ اسلام کی اشاعت کو عالمی سطح پر انجام دیا جاسکے۔ اِس طرح کی بے شمار جدید چیزیں ہیں جو عین اسلام کے حق میں ہیں اور وہ عملاً سب کی سب مغربی تہذیب کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

خاتمہ کلام

امتِ مسلمہ کی تاریخ اب اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے، جب کہ امت کے اندر وہ سوچ پیدا ہو جس کو قرآن کے اندر اجتماعی توبہ کہا گیا ہے، یعنی قومی پالیسی کو بدلنا۔ یہی امت مسلمہ کے مسائل کا واحد حل ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور حل نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ پچھلی صدیوں میں جو حالات پیدا ہوئے، اس کے نتیجے میں، ساری دنیا کے مسلمانوں کے اندر منفی نفسیات کا ذہن پیدا ہوا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی اصل حیثیت کو بھول گئے، یعنی یہ کہ وہ اللہ کے دین کے داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتی ہیں۔

اصل حقیقت کے اعتبار سے، مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت ہے، لیکن مسلمانوں کی منفی نفسیات کی بنا پر یہ ہوا کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان حریف اور رقیب کی نسبت قائم ہوگئی۔ موجودہ زمانے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان اِس نسبت کو درست کیا جائے۔ مسلمانوں کے اندر عمومی طور پر یہ سوچ پیدا کی جائے کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِسی میں مسلمانوں کی دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اِسی میں ان کی آخرت کی کامیابی بھی۔

فکری مستویٰ کے مطابق خطاب

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُعثنا معاشر الأنبیاء نخاطب الناس، علی قدر عقولهم (المقاصد الحسنة للسخاوي، رقم الحدیث: 120) یعنی تمام پیغمبروں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے عقلی معیار کے مطابق، خطاب کریں۔

اِس حدیث میں 'قدرِ عقل' سے مراد فکری مستوی (intellectual level) ہے، یعنی لوگوں سے ایسی زبان میں خطاب کرنا جو اُن کے لیے قابلِ فہم ہو اور ان کے ذہن کو ایڈریس کرے۔ جس دعوتی خطاب میں مدعو کی یہ رعایت شامل نہ ہو، وہ مطلوب دعوتی خطاب نہیں۔ اِس حدیثِ رسول کا ایک تقاضا یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اگر ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو جائے تو داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کرے کہ مدعو کے ذہن کے اعتبار سے، اس کا کلام ایک موثر کلام بن جائے۔

موجودہ زمانے کی نسبت سے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم علما اپنی تعلیم کے اعتبار سے، صرف روایتی ذہن کو خطاب کرنا جانتے ہیں۔ اِس بنا پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علما کی پہنچ سے باہر ہو گیا ہے۔ علما کا روایتی طرزِ خطاب جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں علما کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کریں کہ وہ جدید ذہن کو خطاب کرنے کے قابل ہوسکیں۔

جدید فکری مستوی کوئی پراسرار چیز نہیں، وہ دراصل عقلی مستوی (rational level) کا دوسرا نام ہے۔ آج کا انسان صرف اُس کلام سے متاثر ہوسکتا ہے جو جدید عقلی معیار پر پورا اترتا ہو، جو دورِ جدید کے مسلّمات سے مطابقت رکھنے والا ہو، جو دینی حقائق کو عقل کے معروف اصولوں پر ثابت شدہ بناتا ہو۔ قدیم اسلوب کو اگر روایتی اسلوب کہا جائے تو جدید اسلوب کو سائنسی اسلوب کہا جائے گا۔

جو بات مذکورہ حدیثِ رسول میں کہی گئی ہے، اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ ابراہیم میں یہ آیت آئی ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ

لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (14:4) یعنی ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا، اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، تاکہ وہ اُن سے اچھی طرح بیان کردے:

> And We have not sent any Messenger except with the language of his people in order that he might make the message clear to them.

قرآن کی یہ آیت پیغمبر کے حوالے سے ہر دور کے تمام داعیوں کے لیے ہے۔ بعد کے زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے داعیوں کی بھی وہی ذمے داری ہے جو قدیم زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے پیغمبروں کی ذمے داری تھی۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، دعوت الی اللہ کے سلسلے میں داعی کی ذمے داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ مدعو کی زبان میں بول کر اس کو دعوت کا پیغام دے دے۔ اِسی کے ساتھ لازمی طور پر وہ چیز بھی ضروری ہے جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں ''تبیین'' کہا گیا ہے۔ تبیین کا مطلب ہے واضح کرنا، بات کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دینا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے صرف مدعو کی زبان کا جاننا کافی نہیں، اِسی کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھے، وہ مدعو کی ذہنی ساخت کے مطابق، اُس سے خطاب کرے، تاکہ اس کا ذہن ایڈریس ہوسکے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانے میں داعی کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے۔ قدیم زمانہ اگر روایتی اسلوب کا زمانہ تھا تو موجودہ زمانہ سائنٹفک اسلوب کا زمانہ ہے۔ آج کا مدعو کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اُس بات کو عقلی اسلوب میں مدعو کے سامنے پیش کیا جائے۔ اِس شرط کا تقاضا ہے کہ داعی نہ صرف آج کی زبان سیکھے، بلکہ وہ آج کے ذہن کو پوری طرح سمجھے اور جدید ذہن کو سمجھنے کا یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ انتہائی بے تعصّبانہ انداز میں جدید افکار کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں مدعو کے لیے کامل خیر خواہی موجود ہو۔ اگر کامل خیر خواہی موجود نہ ہو تو نہ زبان کا جاننا کافی ہوسکتا ہے اور نہ جدید علوم کا مطالعہ۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تمام علما مستشرقین (orientalists) کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ وہ مستشرقین کو اسلام کا دشمن اور اسلام کے خلاف سازش کرنے والا

قرار دیتے ہیں، حتی کی ایک عرب عالم نے مستشرقین کو دورِ جدید کے تین اژدہوں میں سے ایک اژدہا قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: أجنحة المكر الثلاثة، تالیف: عبد الرحمن حبنكه الميداني)

مستشرقین کے بارے میں یہ رائے یقینی طور پر درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مسلم علما، مغربی مستشرقین کو غیر متعصّبانہ ذہن کے ساتھ نہ پڑھ سکے، اِس لیے وہ اُن کے کیس کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ مستشرقین کے کیس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس فرق کو سمجھا جائے جو مسلم علما اور مستشرقین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مسلم علما دین اسلام کو وحی (revelation) کے ظاہرہ کے تحت دیکھتے ہیں۔ اِس کے برعکس، مستشرقین اپنے طریقِ مطالعہ کے تحت دینِ اسلام کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) یا تاریخی ظاہرہ (historical phenomenon) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ طریقِ مطالعہ کے اِس فرق کی بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی رائے میں کچھ فرق واقع ہوجاتا ہے۔ یہ فرق یقینی طور پر کسی سازشی ذہن یا بدنیتی کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف طریقِ مطالعہ (method of study) میں فرق کی بنا پر ہوتا ہے۔

استشراق کی حقیقت

استشراق (orientalism) کیا ہے، استشراق اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، صرف ایک چیز کا نام ہے، وہ یہ ہے کہ نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد مختلف اسباب سے یورپ میں ایک ذہن ابھرا جس کو روحِ تجسس (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے۔ اِس روحِ تجسس نے مزید ترقی پاکر موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کا عنوان اختیار کیا۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والے تمام علوم، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، وہ اصلاً اِسی طریقِ مطالعہ کی پیداوار ہیں۔ اِس طریقِ مطالعہ کا استعمال بنیادی طور پر دو بڑے میدانوں میں ہوا — ایک، علمِ فطرت (natural sciences) اور دوسرا، علمِ انسانیات (humanities)۔ اِس طریقِ مطالعہ سے بہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔ ہر شعبے میں نئی نئی حقیقتیں سامنے آئیں، تحقیق کے نئے نئے دروازے کھلے، سوالات کے نئے نئے جوابات ملے، زندگی کے لیے نئی نئی رہنمائیاں حاصل ہوئیں۔

تاہم علم کے دونوں شعبوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ علمِ فطرت کا میدان فطرت کے اٹل قوانین تھے۔ اس میں یہ ممکن تھا کہ علمِ ریاضی (mathematics) کے قطعی فارمولے کو استعمال کرتے ہوئے قطعی نتیجے تک پہنچا جائے اور اگر بالفرض کوئی انسان اپنے اندازے میں غلطی کر جائے تو دوسرا انسان مزید تجزیہ کے ذریعے اس کی تصحیح کر سکے۔ اسی لیے اِن علوم کو قطعی علوم (exact sciences) کہا جاتا ہے۔

لیکن علم انسانیات، بہ شمول مذہب، میں اِس کے استعمال کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اِس شعبے میں حتمی نوعیت کا کوئی ریاضیاتی طریقہ قابلِ حصول نہ تھا، اِس لیے یہاں لازمی طور پر یہ ہونا تھا کہ انسانیات کے شعبے میں مطالعہ کرنے والوں کی رائے میں اختلاف پیدا ہو، وہ کسی معاملے میں غلط استنباط (wrong inference) کا شکار ہو جائیں۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسانیات کے دائرے میں مطالعہ کرنے والا انسان کوئی ایسا اصول وضع کر سکے جس میں سرے سے کوئی غلطی نہ پائی جاتی ہو۔ انسانیات کے مطالعے میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں، وہ اختلافِ رائے کی بنا پر ہیں، نہ کہ سازش یا بدنیتی کی بنا پر۔ یہی استشراق کا معاملہ ہے۔ استشراق کا کیس ایک طریقِ مطالعہ کا کیس ہے، نہ کہ سازش یا بدنیتی کا کیس۔

اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مستشرقین کے اِس ذہن کو مدعو کے ذہن کے طور پر لیا جائے، نہ کہ کسی دشمن کے سازشی ذہن کے طور پر۔ ہر مدعو کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ اِس طرح مستشرقین کا کیس بھی مدعو کا کیس ہے اور ان کی بھی اپنی ایک سوچ ہے۔ اگر ہم مستشرقین کے کیس کو مدعو کے کیس کے طور پر لیں تو ہمارے دل میں اُن کے بارے میں وہی خیر خواہی پیدا ہو جائے گی جو ہر مدعو کے لیے ایک داعی کے دل میں ہوتی ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ ہم مستشرقین کے ذہن کو غیر جانب دارانہ انداز میں سمجھیں اور اُن سے داعیانہ ذہن کے تحت ڈسکشن کریں اور اُن کو اسلام کا فطری پیغام پہنچائیں۔ مستشرقین بھی انسان ہیں۔ اُن کے اندر بھی وہی فطرت موجود ہے جو دوسرے انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اگر اُن کی فطرت ایڈریس ہو جائے تو اُن کے ساتھ وہی واقعہ پیش آ سکتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)

تاریخ بتاتی ہے کہ مستشرقین کے معاملے میں اِس طرح کے واقعات بار بار پیش آئے ہیں۔ بہت سے ایسے مستشرق ہیں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی اعلی کتابیں لکھیں۔ مثلاً ٹامس کارلائل (وفات: 1881)، ٹی ڈبلو آرنلڈ (وفات: 1930)، فلپ کے ہٹی (وفات: 1978)، وغیرہ۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کے تفصیلی مطالعے کے بعد باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔ مثلاً ہنگری کے عبدالکریم جُرمانوس (وفات: 1979)، وغیرہ۔

مستشرق عام طور پر اُس کو کہا جاتا ہے جو کسی مغربی ملک میں پیدا ہوا اور پھر وہ مشرقی مذاہب کا مطالعہ کرے۔ لیکن توسیعی طور پر اِس فہرست میں ایسے افراد بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں پیدا ہوئے ہوں اور پھر وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کریں اور مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیں۔ اِس دوسری قسم میں بھی بہت سے افراد پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے، وغیرہ۔ ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

Chattopadhyay, Nishikanta(1852-1910) research scholar and the first Bengali to obtain a PhD degree(1882) from a European university, was born in July 1852 in the village of Pashchimpara in Vikrampur, Dhaka. Nishikanta passed the FA from Presidency College. He then went to Germany to study German, Sanskrit, linguistics, history and philosophy at Leipgiz University. But he was expelled from there for being an atheist. He proceeded to Switzerland and completed his doctoral studies at the University of Zurich. He returned to India in 1883and subsequently taught at different colleges in Hyderabad, Mysore and Muzaffarpur. Towards the end of his life, he embraced Islam.

(http //:www.banglapedia.org)

ضمیر کی آزادی

خدا کی تخلیقی اسکیم میں انسانی آزادی کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انسان کو اِس دنیا میں امتحان کے لیے رکھا گیا ہے، اور آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں۔ انسان کا مستقبل تمام تر اِس پر منحصر ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے، یا وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اگر انسان کی آزادفکری پر روک لگا دی جائے تو اس کے بعد امتحان کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔

قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (2:256) یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اِسی طرح قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ○ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ○ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (88:21-26) یعنی (اے پیغمبر) تم بس یاددہانی کرو، تم بس یاددہانی کرنے والے ہو۔ تم اُن پر داروغہ نہیں۔ مگر جس شخص نے روگردانی کی اور انکار کیا، تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی، پھر ہمارے ہی ذمے ہے اُن کا حساب لینا۔

اِس طرح کی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو اِس بات کی کامل آزادی دی گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، سوچے اور جس طرح چاہے، بولے اور لکھے۔ یہ آزادی انسان کو اُس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک کہ وہ دوسرے انسانوں کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسلام میں سماجی جرم (social crime) کا تصور ہے، مگر اسلام میں فکری جرم (thought crime) کا کوئی تصور نہیں۔

لندن سے 406 صفحات پر مشتمل ایک کتاب چھپی ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Richard Dawkins, *The God Delusion* (2006)

کتاب کے مصنف نے افغانستان کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، جب کہ ایک افغانی شخص (عبدالرحمن) نے اپنا مذہب بدل دیا۔ اُس نے اسلام کو چھوڑ کر مسیحی مذہب اختیار کرلیا۔ اِس پر افغانستان کی عدالت میں اس کے لیے موت کی سزا سنائی گئی۔ اِس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

> It is still an article of constitution of 'liberated' Afghanistan that the penalty for apostasy is death. Apostasy, remember, doesn't mean actual harm to persons or property. It is pure thought crime, to use George Orwell's 1984 terminology, and the official punishment for it under Islamic law is death. (p. 287)

یعنی اب بھی آزاد افغانستان کے قانون کا ایک حصہ یہ ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ یاد رکھئے کہ ارتداد کا مطلب کسی انسان کو یا کسی کی پراپرٹی کو حقیقی نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ 1984 میں انگلش آتھر جارج آرویل کی وضع کردہ اصطلاح کو لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خالص 'فکری جرم' ہے، اور اسلام کے قانون کے مطابق، اِس جرم کی مسلّمہ سزا قتل ہے۔

یہ صرف غلط فہمی کا ایک معاملہ ہے۔ مصنف نے افغانستان میں ہونے والے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے اور اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس قانون کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ بعد کے کچھ فقہا کا مسلک ہے، نہ کہ قرآن اور سنت کا مسلک۔ اسلام کے قانون کا مستند ماخذ صرف قرآن وسنت ہے، کوئی بھی دوسری چیز اسلام میں قانون کا ماخذ نہیں۔

جدید مغربی فکر میں آزادی کو خیر اعلیٰ (summum bonum) سمجھا جاتا ہے۔ مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ آزادیٔ فکر کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اِس کے برعکس، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں صرف محدود آزادی کا تصور ہے، اِس لیے اسلام دورِ جدید کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ بات صرف غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں آزادی کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ مغربی تہذیب میں۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے، کیوں کہ اسلام کے مطابق، انسان کو موجودہ دنیا میں امتحان (test) کے لیے رکھا

گیاہے۔امتحان کے لیے آزادی لازمی طور پر ضروری ہے۔آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں، اِس لیے آزادی خود خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کا ایک لازمی حصہ ہے۔

اسلام میں آزادی ہر انسان کا مطلق حق ہے، لیکن وہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ شرط وہی ہے جو خود مغربی تہذیب کا مسلّمہ ہے، یعنی انسان کو آزادی صرف اپنے ذاتی دائرے میں حاصل ہے۔ آدمی کی آزادی اُس وقت ختم ہوجاتی ہے، جب کہ وہ دوسرے کے لیے ضرر رساں (harmful) بن جائے۔

اِس کے علاوہ، اسلام میں آزادی ایک اور لحاظ سے بھی ہے۔ خالق نے اِس دنیا میں ہر چیز کو امکان (potential) کے طور پر پیدا کیا۔ اِس امکان کو واقعہ بنانے کا کام انسان کو خود کرنا ہے۔ مثلاً خالق نے خام لوہا (ore) بنایا۔ خام لوہے کو مشین کی صورت دینا، یہ انسان کا اپنا کام ہے۔ یہ تمام ترترقیاں صرف اُس وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب کہ انسان کے اندر آزادانہ طور پر ذہنی سرگرمیاں جاری ہوں۔ اِس مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان کو اِس دنیا میں کامل آزادی حاصل ہو۔

تاہم اسلام میں جرم کی دو قسمیں ہیں — جرم بہ مقابلہ انسان (crime vis-à-vis man) اور جرم بہ مقابلہ خدا (crime vis-à-vis God)۔ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جہاں تک انسان کا معاملہ ہے، ہر انسان کو دوسرے انسان کے مقابلے میں مکمل طور پر فکری آزادی حاصل ہے۔ اُس کا معاملہ صرف اُس وقت قابلِ مواخذہ یا قابلِ سزا (punishable) بنے گا، جب کہ وہ دوسرے انسان کے لیے عملی طور پر جارح بن جائے۔

مگر خدا کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ کوئی شخص خدا کو عملی جراحت نہیں پہنچا سکتا۔ خدا کے معاملے میں جرم یہ ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف رویہ اختیار کرے، وہ خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کا اتباع نہ کرے۔ اِس میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان خدا کے معاملے میں غلط عقیدہ بنائے۔ مثلاً خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا، انسان کو خدا کا بیٹا قرار دینا، خدا کے پیغمبر کا انکار کرنا، وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اگر چہ تھاٹ کرائم (thought crime) کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن وہ خدا کے نزدیک، قابلِ سزا کرائم (punishable crime) ہیں۔ ایسے لوگ اگر اِسی حال میں مریں تو بلاشبہہ وہ

خدا کی سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔ لیکن جرم بہ مقابلۂ خدا کے معاملے میں، سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے، جو کہ آخرت میں کسی انسان کو دی جائے گی۔ جرم بہ مقابلہ انسان کے بارے میں فیصلہ کرنا، انسانی عدالت کا کام ہے۔ لیکن جرم بہ مقابلہ خدا کا تعلق انسانی عدالت سے نہیں۔ ایسے معاملے میں انسان کو صرف پرامن دعوت وتبلیغ کا حق ہے، نہ کہ عملی سزا کا حق۔

اسلام میں آزادئ ضمیر (freedom of conscience) کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کہ کسی دوسرے نظامِ فکر میں۔ البتہ اسلامی نظامِ فکر اور سیکولر نظامِ فکر میں اِس اعتبار سے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ سیکولر نظامِ فکر میں آزادئ ضمیر کو مطلق (absolute) حیثیت حاصل ہے، یعنی سیکولر نظامِ فکر کے مطابق، ایک شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو مطلق معنوں میں صداقت سمجھے، مگر اسلامی نظامِ فکر میں ایسا نہیں۔ اسلامی نظامِ فکر کے مطابق، صداقت کا معیار کسی کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ اس کا معیار وحی الٰہی ہے۔ جو تصور وحی الٰہی کے مطابق ہو، وہی درست تصور ہے۔ اور جو تصور وحی الٰہی سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ انسان کا ذاتی واہمہ (obsession) یا کنڈیشننگ کا نتیجہ ہے، نہ کہ مطلق معنوں میں صداقت۔

آزادئ ضمیر سے وابستہ یہ سوال بھی ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی کا حکم کیا ہے۔ اِس معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ انسان کو اظہارِ خیال کی آزادی کا کلی حق حاصل ہے۔ آدمی جب تک دوسرے انسان کے لیے جارح نہ بنے، اس کو کامل معنوں میں اظہارِ خیال کی آزادی حاصل رہے گی۔ مگر اسلام کے مطابق، انسانی زندگی کے دو مرحلے ہیں — موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ اظہارِ خیال کی کامل آزادی کا حق صرف موت سے قبل کی دنیا کے لیے ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں خدا یہ فیصلہ کرے گا کہ کس نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا اور کس نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ پھر اس کے بعد ہر ایک کے لیے اس کے دنیوی ریکارڈ کے مطابق، انعام یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔

عصری تقاضے —— چند قابلِ غور پہلو

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنّ اللہ یبعث لهذه الأمّة علیٰ رأس کلّ مائة سَنة، مَن یجدّد لها دینها (سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یُذکر في قرن المائة)** یعنی اللہ اِس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر ایک شخص کو اٹھائے گا جو اُس کے لیے اُس کے دین کی تجدید کرے گا۔

یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ فطری قانون کے تحت پیش آنے والا ایک معاملہ ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی عمر بہت محدود ہے۔ وہ سو سال سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ اِس طرح ہمیشہ ایک کے بعد دوسری نسل آتی رہتی ہے۔ ایک تیار شدہ نسل ختم ہوجاتی ہے، اس کے بعد ایک غیر تیار شدہ نسل پیدا ہوکر اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ جس طرح پہلی نسل کو تیار کیا گیا تھا، اُسی طرح دوبارہ اگلی نسلوں کو تیار کیا جائے۔ زوال کا مذکورہ عمل ایک مسلسل عمل ہے، اور اِسی کو انحطاط (degeneration) کہا جاتا ہے۔ تجدید اِسی صورتِ حال کی اصلاح کا نام ہے۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس فطری پراسس کے معاملے میں امتِ محمدی کا کوئی استثنا نہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت پر جب زوال کا دور آیا، تو بار بار مجددینِ اسلام پیدا ہوتے رہے۔ مثلاً عمر بن عبد العزیز اُموی (وفات: 720ء)، ابن تیمیہ الحرانی (وفات: 1328ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1762ء)، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلّمہ طور پر مجدد تھے، اور انھوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تجدید کا کام کیا۔

دو دور

امتِ مسلمہ کے ثابت شدہ طور پر دو دور ہیں —— روایتی دور (traditional period)، اور سائنسی دور (scientific period)۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلی صدیوں میں جو مجددینِ اسلام پیدا ہوئے، وہ سب روایتی دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے روایتی ڈھانچے میں دین کو

ازسرِنو منقح کر کے پیش کیا۔اب امتِ مسلمہ سائنسی دور میں پہنچ چکی ہے۔ اِس دور کے حالات مکمل طور پر پچھلے دور سے مختلف ہیں۔ اِس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلم اسکالر نے کہا تھا کہ:

Quran has to be re-revealed today.

مگراصل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ — ضرورت ہے کہ آج قرآن کی دوبارہ توضیح کی جائے:

Quran has to be re-defined today.

تجدید دین دراصل اِسی توضیح ثانی (re-defination) کا نام ہے۔ مجدد وہ ہے جو بدلے ہوئے حالات کو سمجھے اور نئے حالات میں دین کو دوبارہ واضح کرے۔ یہ کام اپنی حقیقت کے اعتبار سے تجدید (revival) کا کام ہے۔ یہ اصلِ دین کا دوبارہ احیا ہے۔ اس کا کوئی تعلق اُس عمل سے نہیں جس کو موجودہ زمانے میں اصلاح (reformation) یا نظر ثانی (revision) کہا جاتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں تجدید کا یہ کام پوری شدت کے ساتھ مطلوب ہو چکا ہے۔ اب جب کہ سائنسی تحقیقات کے مطابق، سائنس داں یہ اعلان کررہے ہیں کہ انسانی تاریخ اپنے خاتمہ (end) پر پہنچنے والی ہے۔ جس زِلزالِ شدید (99:1) کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، اس کے آثار عملاً شروع ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ — قیامت اب زیادہ دور نہیں:

Doomsday is not far.

ایسی حالت میں اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس کو متعین کیا جائے کہ جدید دورِ سائنس کی نسبت سے تجدید واحیا کا جو کام مطلوب ہے، وہ کیا ہے۔ اور وہ کام کیا ہے جس کو جدید حالات کی نسبت سے تجدید واحیا کا کام کہا جائے گا۔ قرآن اور حدیث کے حوالے سے اِس کام کی نوعیت کو پوری طرح معلوم کیا جا سکتا ہے۔

آفاق اور انفس میں ظاہر ہونے والی نشانیاں

قرآن میں واضح طور پر یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ بعد کے دور میں فطرت کی چھپی ہوئی

نشانیاں (signs) ظاہر ہوں گی، اور یہ ضرورت ہوگی کہ اِن نشانیوں کی روشنی میں دینِ خداوندی کو از سرِ نو مدلّل کیا جائے۔ یہ ضرورت قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”عن قریب مستقبل میں ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر یہ پوری طرح کُھل جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے“ (41: 53)۔

آفاق اور انفس میں جن نشانیوں کے ظہور کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ واضح طور پر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ کے معاصر فرعون کا جسم خدا نے محفوظ کردیا ہے، اور وہ بعد کے زمانے میں ظاہر ہوگا (10: 92)۔ اِس آیت کے نزول کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہ واقعہ لوگوں کے لیے غیر معلوم رہا۔ انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار سائنسی ذرائع سے یہ ممکن ہوا کہ فرعون کے اِس جسم کو دریافت کیا جاسکے اور اس کی معاصر تاریخ کا تعین کیا جاسکے۔ اِس طرح کے بہت سے نئے حقائق ہیں، جو قرآن کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ دورِ جدید کے تجدیدی کام کا ایک حصہ ہے، یعنی اِن نئی دریافتوں کو قرآن کی صداقت کی حیثیت سے پیش کرنا۔

لسانِ قوم میں دعوت

قرآن کی سورہ ابراہیم میں پیغمبروں کے بارے میں بتایا گیا ہے: وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِۦ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (14: 4) یعنی خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھی آیا، وہ اپنی مخاطب قوم کی زبان میں کلام کرتا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں ’لسان‘ سے مراد صرف زبان (language) نہیں ہے، بلکہ اُس میں کلام کا اسلوب (idiom) بھی شامل ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان میں کلام کیا۔ یہ آپ کے لیے قوم کی زبان (لسانِ قوم) میں بولنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمین اور آسمان کے ملکوت (6: 76) سے استدلال کرتے ہوئے مدعو کے سامنے اپنے بات پیش کی۔ اور حضرت مسیح نے تمثیل (metaphor) کے انداز میں اپنی بات کہی۔ یہ دونوں اسلوب کی

مثالیں ہیں، جو اپنے زمانے کے لحاظ سے استعمال کی گئیں۔

موجودہ زمانے میں دعوتی کلام وہ ہے جو وقت کی زبان میں ہو۔ وقت کی زبان کا ایک مطلب داعی کے اپنے علاقے کی زبان ہے۔ پھر یہ کہ موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ اِس لحاظ سے ضروری ہے کہ داعی آج کی انٹرنیشنل زبان میں کلام کرے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، آج کی انٹرنیشنل زبان صرف ایک ہے، اور وہ انگریزی زبان ہے۔

''لسان'' کے مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاصر مخاطبین کے اسلوب میں ہو۔ آج کا اسٹینڈرڈ اسلوب وہ ہے جس کو سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ اگر آج کے انسان کو مخاطب کرنا ہے تو ضروری ہے کہ داعی کا کلام وقت کے اسلوب میں ہو، ورنہ یہ حال ہوگا کہ داعی بظاہر بولے گا، لیکن مدعو کا مائنڈ اس سے ایڈریس نہیں ہوگا۔ ایسے کلام کو دعوتی کلام نہیں کہا جاسکتا۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے اور قدیم روایتی اسلوب کیا تھا۔ قدیم روایتی اسلوب وہ تھا جس میں شعر، ادب، خطابت، رومانیت، تمثیل اور مبالغہ آرائی کی زبان میں کسی بات کے کہنے کو بھی کہنا سمجھا جاتا تھا۔ جذباتی طور پر پُرکشش الفاظ بولنے والے لوگ بھی داد کے مستحق قرار پاتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اِس قسم کا اسلوب پوری طرح متروک ہو چکا ہے۔

موجودہ زمانے کا اسٹینڈرڈ اسلوب سائنٹفک اسلوب ہے۔ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو مبنی بر حقیقت اسلوب ہو۔ جس کے الفاظ اور معنی میں کامل مطابقت پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو پورے معنوں میں علمی اور منطقی (rational) اسلوب ہو۔ موجودہ زمانے میں وہی لٹریچر دعوتی لٹریچر ہے جو اِس سائنٹفک اسلوب میں لکھا گیا ہو— یہی سائنٹفک اسلوب قرآن کا اسلوب ہے۔

تعلقاتِ انسانی کا اصول

انسانوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جامع اصول درکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا اصول جو اپنے اور غیر کے درمیان مساوات (equation) کے قیام کی بنیاد بن سکے۔ یہ ایک

ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی سماج کو منظّم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اسلام کی تاریخ میں ابتدائی اور معیاری زمانہ وہ ہے جس کو عہدِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں انسانی تعلقات کی بنیاد جس اصول پر قائم کی گئی تھی، وہ شاہد اور مشہود (85: 3) کی بنیاد تھی۔ یہ دونوں لفظ شہادت (گواہی) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ شاہد کا مطلب ہے گواہ (witness)، اور مشہود کا مطلب ہے وہ جس پر گواہی دی جائے (witnessed)۔ شہادت سے مراد دعوت ہے اور شاہد اور مشہود سے مراد وہی چیز ہے جس کے لیے داعی اور مدعو کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان شاہد اور مشہود کی یہ مساوات (equation) عہدِ رسالت اور عہد صحابہ میں قائم رہی۔ اِس کے بعد عباسی سلطنت کا زمانہ آیا، جب کہ دنیا کے بڑے حصے میں ایک مسلم ایمپائر قائم ہوگیا۔ اب شاہد اور مشہود کی یہ سابق مساوات ٹوٹ گئی اور نئی مساوات، حاکم اور محکوم کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب کہ مسلم فقہاء نے دار الکفر اور دار الاسلام کی اصطلاحیں وضع کیں۔ اِس مساوات کے تحت، دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ مسلم اکثریت کے علاقے دار السلام بن گئے۔ اور اس کے مقابلے میں غیر مسلم علاقے دار الکفر قرار پائے۔

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں (colonial powers) کے ظہور کے بعد یہ مساوات (equation) دوبارہ ٹوٹ گئی۔ اب مغربی تہذیب کے غلبہ کے تحت، دنیا میں جمہوریت (democracy) کا زمانہ آیا۔ سیاست کے جمہوری تصور کے تحت، حاکم اور محکوم کی مساوات بے معنیٰ قرار پائی۔ اُس نے اپنے حق میں فکری اساس کھو دی۔

مسلمانوں اور مغربی قوموں کے درمیان بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں (crusades) پیش آئیں۔ اِن جنگوں میں مغربی قوموں کو شکست ہوئی، لیکن اِس شکست نے مغربی قوموں کے اندر ایک مثبت نتیجہ پیدا کیا۔ یہ لوگ علم کے میدان میں سرگرم ہو گئے، یہاں تک کہ مغربی یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد مغربی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مغربی قوموں نے تجارت اور صنعت کے نئے طریقے دریافت کیے، یہاں تک کہ عمومی پیمانے پر ایک نئی مساوات (equation) قائم ہوگئی۔ یہ تاجر اور خریدار (trader and customer) کی مساوات تھی۔ اِس مساوات کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو خریدار دوست کلچر (customer-friendly culture) کے اصول پر مبنی تھا۔ یہی کلچر آج کی دنیا میں ابھی تک باقی ہے۔

اِس نازک وقت میں مسلمانوں کے ساتھ ایک المیہ (tragedy) پیش آیا۔ مسلمان حاکم اور محکوم کی سابقہ سوچ سے باہر نہ آسکے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جدید اقتصادیات کی مین اسٹریم میں شامل نہ ہوسکے۔ اِس پچھڑے پن کی قیمت مسلمانوں کو یہ دینی پڑی کہ وہ موجودہ زمانے میں دہرا نقصان کا شکار ہوگئے۔

جدید حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر ایک طرف یہ ہوا کہ وہ اقتصادیات میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ دوسرا اِس سے بھی بڑا نقصان یہ تھا کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈبل اسٹینڈرڈ (double standard) کا کیس بن گئے۔ ذہنی طور پر وہ دوسری قوموں کے بارے میں منفی خیالات رکھتے تھے، لیکن ان کا یہ منفی فکر قابلِ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنی مادّی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اُن کو اِنھیں قوموں سے مل کر کام کرنا تھا۔ داخلی طور پر وہ اِن قوموں کے بارے میں منفی ذہن رکھتے ہوئے، خارجی زندگی میں اُنھیں ان قوموں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔

اِس طرح مسلم تاریخ میں پہلی بار ایک سنگین بُرائی پیدا ہوئی، یعنی داخلی طور پر منفی رائے رکھتے ہوئے، خارجی معاملات میں دوسروں کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اپنی مادّی زندگی کی تعمیر کرنا۔ یہ دوعملی یا ڈبل اسٹینڈرڈ کی عمومی حالت تھی۔ اِس قسم کی عمومی دوعملی مسلمانوں کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں آئی۔

اِس برائی سے بچنے کا واحد طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے دورِ اوّل کی طرف فکری واپسی، یعنی دورِ اول کی طرح دوبارہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کی مساوات (equation)

قائم کرنا۔ داعی اور مدعو کی مساوات ہی اسلام کے مطابق، صحیح مساوات ہے۔ اِس مساوات کو دوبارہ قائم کرکے مسلمان موجودہ دوعملی کی بُرائی سے بچ سکتے ہیں اور اِسی کے ساتھ امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی عمومی ذمے داری کوادا کر سکتے ہیں، یعنی دعوت الی اللہ کی ذمے داری۔

آئڈیالوجی آف دعوہ

حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت عملاً زندہ نہ رہے اور پھر کوئی شخص اس کو اپنی کوششوں سے زندہ کرے، تو اِس عمل پر اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے: من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل من عمل بها۔ (الترمذي، رقم الحديث: 2677)

اِس حدیث کو سامنے رکھا جائے اور غور کیا جائے کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی سنت رسول ہے جو آج زندہ نہیں ہے تو بلاشبہہ وہ صرف ایک سنت ہوگی، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھئے تو ان کے درمیان نماز اور روزہ اور حج اور زکاۃ جیسے دینی اعمال بہت بڑے پیمانے پر انجام دیے جارہے ہیں، لیکن صرف ایک ہی بڑی سنت ہے جو آج عملاً زندہ نہیں، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ اِس معاملے میں مسلمانوں کی بےشعوری کا یہ حال ہے کہ وہ ملّی خدمت یا اصلاح المسلمین کا کام کریں گے اور وہ اس کو دعوت الی اللہ کا نام دے دیں گے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کے رشتے کو زندہ کرنا، اِس معاملے میں سنتِ رسول کو زندہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم ترین کام ہے۔ دعوت کی اِسی اہمیت کی بنا پر قرآن میں اُس کو جہادِ کبیر (25: 52) کہا گیا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان دعوت الی اللہ کی سنت کو حقیقی معنوں میں زندہ کرنے کے لیے ایک مکمل دعوہ آئڈیالوجی (ideology of dawah) درکار ہے، ایک ایسی آئڈیالوجی جو دعوت کی اہمیت کو جدید علمی اصول پر مدلّل کرے، جو اُن سوالات کا تشفی بخش جواب دے جو دعوت کے راستے میں ذہنی رکاوٹ (intellectual obstacle) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دعوت کا کام ایک ایسے ماحول کا طالب ہے، جہاں داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور تشدد کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ یہ خاتمہ فریقِ ثانی کی طرف سے کبھی نہیں کیا جائے گا۔ یہ خاتمہ جب بھی ہوگا، وہ داعی گروہ کی طرف سے یک طرفہ طور پر کیا جائے گا، اِسی لیے قرآن میں دعوت کا حکم دیتے ہوئے پیغمبر اسلام سے فرمایا گیا: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7) یعنی مدعو کی طرف سے تمام زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرو اور پوری طرح مثبت انداز میں دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھو۔

جدید نظریات

موجودہ زمانے میں بہت سے ایسے نظریات سامنے آئے ہیں جو بظاہر اسلام کے روایتی موقف سے ٹکراتے ہیں۔ اِس ظاہری ٹکراؤ نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو اِن جدید نظریات کے بارے میں منفی ذہن میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اِن نظریات کی ایسی توضیح کی جائے جو اس معاملے میں مسلمانوں کے منفی ذہن کا خاتمہ کر سکے۔ بصورتِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان وہ نارمل تعلقات قائم نہیں ہوں گے جو دعوت کے مثبت عمل کے لیے ضروری ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں شتمِ رسول کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ایک حساس مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان جب بھی کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہیں یا تقریر سنتے ہیں، جو اُن کے نزدیک شتمِ رسول کے ہم معنیٰ ہو، تو وہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور تشدد کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نہایت سنگین طور پر دعوتی عمل کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ جدید تہذیب کے زیر اثر آج تمام غیر مسلم قوموں میں یہ مان لیا گیا ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی مطلق معنوں میں انسان کا ایک حق ہے، کسی بھی عذر کی بنا پر اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ماحول میں مسلمان جب بطورِ خود شتم کے واقعے کو لے کر ہنگامہ شروع کرتے ہیں اور وہ میڈیا کے ذریعے فوراً لوگوں کے علم میں آ جاتا ہے، تو لوگ یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ اسلام آزادیٔ رائے کے خلاف ہے۔ اِس بنا پر اسلام اِس قابل نہیں کہ وہ جدید انسان کا مذہب بن سکے۔

میں ذاتی طور پر شتمِ رسول کو ایک ایسا معاملہ سمجھتا ہوں جس پر مسلمان صرف دو قسم کے رویّے کا

حق رکھتے ہیں۔ یا تو وہ اس سے اعراض کرتے ہوئے خاموش رہیں، یا دلیل کی زبان میں پُرامن طور پر وہ اس کا جواب دیں۔ اِس موضوع پر میں نے ''شتمِ رسول'' کا مسئلہ کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو 191 صفحات پر مشتمل ہے اور 1997 میں نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

تاہم بالفرض اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ شتمِ رسول ایک قابلِ گردن زدنی معاملہ ہے، اور شتم کا کیس **یُقتل حدًّا** کا کیس ہے، تب بھی اس کو اِس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔ دعوت الی اللہ کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ ایسا شخص اِس معاملے کو **الضّرورات تبیح المحظورات** کے خانے میں ڈالے، اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت، اس کو موجودہ زمانے میں ساقط قرار دے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا منفی ذہن بدستور باقی رہے گا اور وہ دعوت جیسے مثبت عمل کے لیے نااہل (incompetent) قرار پائیں گے۔

اوپر جن مسائل کا بیان ہوا، وہ براہِ راست طور پر دعوت الی اللہ کی تجدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں، ان کے ریفرنس میں دعوت کی اہمیت کو دوبارہ دریافت کرنا ہے۔ نئے حالات میں جو نئے موانع (obstacles) پیدا ہوئے ہیں، ان کا اِس طرح جواب دینا ہے جو دعوت کے راستے کو دوبارہ کھولنے والا ہو۔ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کی بات کرنا دراصل اِنھیں سوالات کو ایڈریس کرنے کا نام ہے۔ اِس سے کم تر درجے کا کوئی عمل موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کے راستے کو ہموار کرنے والا نہیں۔

اِن مسائل سے صرفِ نظر کرکے اگر کوئی کام کیا جائے اور بطور خود اس کو دعوت الی اللہ کا نام دیا جائے، تو یہ قرآن کے الفاظ میں **وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا** (3: 188) کا مصداق ہوگا، یعنی ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا جس کو آدمی نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا۔

آئڈیالوجی یا نظام

اسلام کا نشانہ انسان کو اسلامی بنانا (Islamization of man) ہے، اسلام کا نشانہ اجتماعی نظام کو اسلامی بنانا (Islamization of system) نہیں۔ فرد اور اجتماع کے درمیان یہ فرق عقیدہ کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ وہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی بنیاد پر ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مطابق، یہی چیز ممکن ہے، اِس کے سوا کوئی اور چیز عملاً ممکن ہی نہیں۔

قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن میں فرد کا دین پوری طرح موجود ہے، فکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی۔ لیکن قرآن میں اجتماعی یا سیاسی زندگی کے لیے کوئی مکمل نظام موجود نہیں۔ مکمل نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک ویل اسٹرکچرڈ ماڈل (well-structured model) موجود ہو، مگر ایسا ماڈل نہ قرآن میں بیان ہوا ہے اور نہ حدیث میں۔

فرد کے احکام اور اجتماع کے احکام کے بارے میں یہ فرق کسی اتفاق کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ یہی اصولی طور پر اسلام میں مطلوب ہے۔ اگر یہ اصولی طور پر مطلوب نہ ہوتا تو یقینی طور پر قرآن میں اس کا واضح بیان موجود ہوتا۔ اِس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکمالِ دین (5:3) وہی ہے جو بالفعل قرآن میں موجود ہے، یعنی قرآن میں فرد کی نسبت سے جس دین کا بیان ہے، وہی دین کامل دین ہے اور اجتماع کی نسبت سے قرآن میں جس دین کا بیان ہے، وہی دین اجتماع کی نسبت سے کامل دین ہے۔

قرآن کی سورہ الشوریٰ میں کہا گیا ہے کہ جو دین تمام نبیوں کے درمیان مشترک تھا، وہی 'الدین' ہے اور اُسی الدین کی تم پیروی کرو (42:13)۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تمام نبیوں کے درمیان مشترک دین وہی تھا جو فرد کی نسبت سے مطلوب ہے۔ اجتماع کی نسبت سے اگر کوئی مکمل نظام مطلوب تھا تو وہ مشترک طور پر تمام نبیوں کو دیا ہی نہیں گیا۔ اِس فرق سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے انفرادی دین اور اجتماعی دین دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ ہے، دونوں کا مطالعہ ایک واحد معیار کے تحت نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں 'أقیموا الدین' کا

خطاب فرد سے ہے، یعنی ایک فردِ مسلم کی نسبت سے جو دین مطلوب ہے، اس کو چاہیے کہ اپنی انفرادی زندگی میں وہ اس پر قائم ہوجائے۔

اصولِ عملیت

اِس سلسلے میں ایک حدیث رسول کا مطالعہ کیجئے۔ زیر بحث موضوع کی نسبت سے ایک اہم روایت ہے جوحدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: إن اللّٰہ فرض فرائض فلا تضیّعوھا، وحرّم حرمات فلا تنتھکوھا، وحدّ حدوداً فلا تعتدوھا، وسکت عن أشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا (مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث: 197) یعنی اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، تم اُن کو ضائع نہ کرو۔ اللہ نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، تم اُن کا ارتکاب مت کرو۔ اللہ نے کچھ حدود مقرر کیے ہیں، تم اُن سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ نے کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، تم اُن امور کے معاملے میں بحث مت کرو۔

اِس حدیث رسول میں چار باتوں کا ذکر ہے۔ اِن میں سے ابتدائی تین چیزوں کا تعلق فرد سے ہے۔ فرائض کا اہتمام فرد کرتا ہے۔ حدود سے تجاوز نہ کرنے کا تعلق فرد سے ہے، حرام چیز سے بچنے کا تعلق فرد سے ہے۔ گویا کہ اِن تین فقروں میں ایک شخص کے انفرادی دین کو بتایا گیا۔ حدیث کے آخری فقرے میں جو بات کہی گئی ہے، اس کا ایک پہلو اجتماعی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اجتماع کے معاملے میں دینی روش کا تعلق خود اجتماع یا سماج کے حالات پر منحصر ہے۔ اجتماع کے معاملے میں ایک مومن کی روش کسی پیشگی معیار (ideal) کی بنیاد پر متعین نہیں ہوگی، بلکہ اِس بنیاد پر متعین ہوگی کہ خود اجتماع کے حالات کیا ہیں، یعنی اجتماع کے قبولیت کی سطح (level of acceptance) کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایک مومن کو اپنی انفرادی زندگی میں معیار پسند (idealist) بننا ہے اور اجتماعی زندگی میں وہ روش اختیار کرنا ہے جس کو اصولِ عملیت (pragmatism) کہا جاتا ہے۔

حدیث کے آخری فقرے میں 'سکوت' کا مطلب مطلق سکوت نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی معاملات، یعنی سماجی اور سیاسی معاملات کو اہلِ ایمان کے لیے کھلا (open) رکھا گیا ہے۔ اُن کو یہ

موقع دیا گیا ہے کہ وہ حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے لیے کوئی مناسب روش اختیار کریں۔

اسلام میں فرد کے دین اور اجتماع کے دین کے درمیان تفریق کا یہ اصول اُس مشہور اصول کی بنیاد پر نہیں ہے جو مغرب میں چرچ اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کے بعد پیدا ہوا اور جس کو مذہب اور سیاست کے درمیان علاحدگی کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس معاملے میں مغرب کا اصول مطلق تفریق یا نظریاتی تفریق کے اصول پر قائم ہے۔ اِس کے برعکس، اسلام میں فرد اور اجتماع کے درمیان جو تفریق ہے، وہ ممکن اور ناممکن کے درمیان پائے جانے والے فطری فرق کے اصول پر مبنی ہے، یعنی تقریباً وہی اصول جس کو عام طور پر اِس مقولے میں بیان کیا جاتا ہے کہ —— سیاست ممکن کا آرٹ ہے:

Politics is the art of the possible.

اجتماعی اور انفرادی اصول کے درمیان فرق کی حکمت

خالق نے انسان کو کامل آزادی دی ہے۔ انسانی آزادی خالق کے منصوبے کا ایک لازمی حصہ ہے جس کو منسوخ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر فرد اور اجتماع کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتا ہے۔ چناں چہ جہاں تک فرد کا معاملہ ہے، ہر فرد کی زندگی اس کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے، لیکن فرد سے باہر جو انسانی مجموعہ ہے، اس کا معاملہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ گویا حرکیاتِ فرد کا اصول الگ ہے اور حرکیاتِ اجتماع کا اصول الگ۔

ایک فرد اپنی ذاتی زندگی میں کوئی دینی مسلک اختیار کرے تو اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، لیکن جب آپ اجتماعی زندگی، یعنی سماجی نظام یا سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی لانا چاہیں تو فوراً ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوجائے گا، کیوں کہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ سماجی اور سیاسی نظام پر کوئی شخص یا گروہ پہلے سے اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے ہوتا ہے۔ جب آپ سماجی اور سیاسی نظام میں تبدیلی کا علم بلند کرتے ہیں تو فوراً ہی آپ کا ٹکراؤ اُن لوگوں سے شروع ہوجاتا ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اُن کو اُن کے اقتدار کے منصب سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی شخص یا گروہ اِس قسم کی معزولی کو برداشت نہیں کرسکتا، اِس لیے وہ فوراً اپنے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر طرفین کے درمیان ایک ایسی لڑائی شروع

ہو جاتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں کسی ایک فریق کی جیت کبھی لڑائی کا خاتمہ نہیں کرتی، کیوں کہ جو فریق ہارتا ہے، وہ فوراً ہی انتقام (revenge) کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے دوبارہ ایک نئی جنگ چھیڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی جوابی کارروائی کی پوزیشن میں نہ ہو، تب بھی وہ خودکش بم باری شروع کر دیتا ہے، تاکہ اگر وہ فریقِ ثانی کو ہرا نہیں سکتا تو کم از کم اس کو نقصان پہنچائے یا اُس کو کم از کم غیر مستحکم (unstable) کر دے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اگر ''کامل دین'' کے نام پر اِس اصول کو اختیار کرلیا جائے کہ فرد نے جس دین کو اپنے لیے اختیار کیا ہے، اُسی دین کو اُسے اجتماع پر بھی نافذ (implement) کرنا ہے، تو اِس کے نتیجے میں دونوں فریق کے درمیان ایک ایسی لڑائی شروع ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ یہی پوری تاریخ کا عملی تجربہ ہے۔

پریکٹکل فارمولا

ایسی حالت میں خالق کے منصوبے کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام میں ایک ایسا اصول بتایا گیا جو ہمیشہ کے لیے امن کا ضامن بن جائے، جو ہر حال میں امن کے قیام کو یقینی بنانے والا ہو۔ کیوں کہ کسی بھی قسم کی تعمیر کے لیے امن لازمی طور پر ضروری ہے امن نہیں تو تعمیری سرگرمیاں بھی نہیں۔

مذکورہ صورتِ حال کی بنا پر اجتماع کے لیے کوئی معیاری فارمولا ممکن نہیں، اِس لیے اسلام میں ایڈجسٹ مینٹ کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ایک ایسا فارمولا اختیار کیا گیا ہے جس کو اِس معاملے میں پریکٹکل فارمولا (practical formula) کہا جاسکتا ہے۔ اِس فارمولے کو قرآن میں أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اجتماعی معاملے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جس پر اجتماعی مشورے کے بعد لوگ راضی ہو جائیں۔

شوریٰ یا جمہوریت کا اصول

اجتماعی معاملے میں کسی مطلق معیار کے بجائے لوگوں کی رائے سے فیصلہ کیا جانا کوئی سادہ بات

نہیں، یہ ایک اہم اجتماعی اصول ہے۔ جب انسانی مجموعہ یا مجتمع (human society) کا معاملہ ہو تو اس کے اندر نظمِ اجتماعی قائم کرنے کی دو صورتیں ہیں — ایک یہ کہ ایک شخص کو حاکمِ مطلق کی حیثیت حاصل ہو اور وہ سب کے اوپر اپنی مرضی نافذ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مجموعے کے ہر فرد کو اپنی رائے دینے کا موقع دیا جائے اور پھر یا تو اتفاقِ عام یا کثرتِ رائے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ پہلے طریقے کو آمریت (dictatorship) کہا جاتا ہے اور دوسرے طریقے کو جمہوریت (democracy)۔ اسلام میں شوریٰ کا اصول عملاً وہی ہے جس کو موجودہ زمانے میں جمہوریت کہا جاتا ہے۔

شوریٰ یا جمہوریت کا یہ اصول شرعی عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے، یہ فطرت کے ایک اصول پر مبنی ہے۔ خالق نے مصلحتِ امتحان کے تحت ہر عورت اور مرد کو کامل آزادی عطا کی ہے، یہ آزادی قیامت سے پہلے منسوخ ہونے والی نہیں۔ ایسی حالت میں نظمِ اجتماعی (socio-political system) کو کس بنیاد پر قائم کیا جائے۔ اگر نظمِ اجتماعی کے لیے ایک معیاری اصول مقرر کر دیا جائے اور یہ مطلوب ہو کہ پورے انسانی مجموعے کو اسی معیاری اصول کے تابع بنانا ہے۔ ایسی حالت میں لازماً یہ ہوگا کہ ابدی طور پر لوگوں کے درمیان ٹکراؤ کی حالت جاری رہے گی۔ کچھ لوگ اِس معیاری اصول کو مانیں گے اور کچھ لوگ اپنے چوائس (choice) کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اِس طرح سماج مستقل طور پر دو متحارب گروہ میں تقسیم ہو جائے گا، اُن کے درمیان ایسی لڑائی جاری ہو جائے گی جو کبھی ختم نہ ہو۔

ایسی حالت میں ہمارے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب (choice) ہے — ایک، معیاری اجتماعی اصول پر اصرار کرنا، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ معیاری اجتماعی اصول تو عملاً کبھی قائم نہ ہو اور نتیجۃً انسانی معاشرہ ہمیشہ کے لیے امن (peace) سے محروم ہو جائے۔ اس معاملے میں دوسرا انتخاب یہ ہے کہ نظمِ اجتماعی کے لیے کوئی مطلوب اصول نہ ہو، بلکہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کے اصول پر یہ کیا جائے کہ اجتماعی نظم کے معاملے میں رائے عامہ کو عملاً تسلیم کر لیا جائے۔ اِس طرح سماج میں فوری طور پر امن قائم ہو جائے گا اور ہر فرد کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے انفرادی دائرے میں

تعمیر وترقی کا جو منصوبہ چاہے، اس کو بروئے کار لا سکے۔

فطرت کے اِس اصول کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: كما تكونون، كذلك يُؤَمّر عليكم (البيهقي، شعب الإيمان: 22/6) یعنی جیسے تم لوگ ہوگے، ویسے ہی تمھارے حکمراں ہوں گے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی انتظام (political administration) مطلق معنوں میں کسی اصول کے تابع نہیں ہوگا، بلکہ معاشرے کی رائے عامہ کے مطابق، اس کا تعین کیا جائے گا۔ اِس بات کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں حکومت کے معاملے کو کسی مطلق معیار (political idealism) کے تابع نہیں کیا گیا، بلکہ وہ عملی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کو سیاسی بندوبست (political adjustment) کا طریقہ کہا جاسکتا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ الفرقان اِس آیت سے شروع ہوتی ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ (25:1) یعنی بڑا بابرکت ہے اللہ جس نے فرقان (قرآن) اتارا، تاکہ وہ سارے عالم کے لیے آگاہ کرنے والا بنے۔

اِس آیت کے مطابق، قرآن ایک کتابِ فرقان ہے، یعنی فرق کرنے والی کتاب۔ فرقان فرق کا مبالغہ ہے۔ اِس کا مطلب ہے: الفصل بين الشيئين (دو چیزوں کے درمیان فرق کرنا)۔ یہ بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت کی بنا پر تمام چیزیں غیرممیّز حالت میں پائی جاتی ہیں۔ انسان کی یہ لازمی ضرورت ہے کہ وہ اِن چیزوں کو درست طور پر سارٹ آوٹ (sort out) کرسکے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں انسان فکری اعتبار سے، کنفیوژن (confusion) کا شکار ہوجائے گا اور عملی اعتبار سے وہ اپنے کاموں کی نتیجہ خیز پلاننگ نہ کرسکے گا۔ اِس اصول کو دوسرے الفاظ میں فطرت کا نظام کہا جاسکتا ہے۔ اِس دنیا میں کوئی بھی کامیابی صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ فطرت کے اِس نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔

انسان بظاہر وسیع کائنات کا ایک حصہ ہے، لیکن انسان کی ایک ممیز صفت ہے جو بقیہ کائنات

میں موجود نہیں، وہ یہ کہ انسان کی زندگی بیک وقت دو مختلف تقاضوں کا مجموعہ ہوتی ہے— فرد (individual) اور اجتماع (society)۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ فرد اور اجتماع کے تقاضے مشترک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں، بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کی زندگی گویا ایک قسم کا مجموعۂ اضداد (mixture of opposites) کی حیثیت رکھتی ہے۔

بقیہ کائنات کا معاملہ اِس سے مختلف ہے، بقیہ کائنات میں یہ تقسیم موجود نہیں۔ بقیہ کائنات کا معاملہ یہ ہے کہ جو ایک درخت کا کیس ہے، وہی پورے باغ کا کیس ہے، جو ایک قطرۂ آب کا کیس ہے، وہی پورے سمندر کا کیس ہے، جو ایک ستارے کا کیس ہے، وہی پوری کہکشاں کا کیس بھی ہے۔ بقیہ کائنات میں واحدہ (unit) اور مجموعہ دونوں کا کیس یکساں ہے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں— انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسانی زندگی کی منصوبہ بندی میں اِس فرق یا اختلاف کو ملحوظ رکھنے کا نام کامیابی ہے اور اِس فرق یا اختلاف کو ملحوظ نہ رکھنے کا نام ناکامی۔

تاریخ کی تصویر

تاریخ میں جو سوچنے والے لوگ (thinkers) گزرے ہیں، اُن میں سے تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی سوچ کے مطابق، ایک عظیم فکری نشانہ (great vision) کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن ساری کوشش کے بعد آخر میں وہ اپنے نشانہ (goal) کو حاصل کرنے کے بارے میں ناامید ہوگئے۔ اور جب وہ دنیا سے گئے تو وہ مایوسی (despair) کا کیس بن چکے تھے۔ ارسطو (Aristotle) سے لے کر برٹرنڈ رسل تک کتنے لوگ ہیں جنھوں نے آئڈیل گورنمنٹ کے قیام کو اپنا نشانہ بنایا، لیکن ساری کوشش کے باوجود وہ عملاً آئڈیل گورنمنٹ نہ بنا سکے۔ لیوٹالسٹائے (Leo Tolstoy) سے لے کر مہاتما گاندھی تک کتنے لوگ ہیں، جنھوں نے پرامن دنیا (peaceful world) بنانے کا خواب دیکھا، لیکن اُن کا خواب کبھی عملی واقعہ نہ بن سکا، یہاں تک کہ ناکامی کے احساس کے ساتھ وہ اِس دنیا سے چلے گئے۔

سید قطب سے لے کر ڈاکٹر محمد مرسی (مصر) تک کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اپنا یہ مشن بنایا کہ ان کو دنیا میں انصاف (justice) پر مبنی نظام قائم کرنا ہے، مگر اُن کا آخری احساس یہ تھا کہ ساری کوشش کے باوجود دنیا میں وہ اپنا مطلوب نظام قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اُن سب کا حال وہی ہوا جو رابندر ناتھ ٹیگور نے تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا تھا— ساری عمر بینا (ستار) کے تاروں کو سلجھانے میں بیت گئی، مگر جو انتم گیت میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

منصوبۂ تخلیق

یہ پوری تاریخ کا ایک عظیم فکری المیہ (intellectual tragedy) ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے— زندگی کے بارے میں خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) سے بے خبر ہونا اور خود ساختہ ذہن (self-styled mindset) کے تحت منصوبہ بنا کر اس کو ایک ایسی دنیا میں بروئے کار لانے کی کوشش کرنا جو اُس کے مطابق، بنائی نہیں گئی تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84) یعنی ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کررہا ہے۔ اب تمھارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستے پر ہے۔

قرآن کی اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا منصوبۂ اشیا (scheme of things) ہی صحیح تخلیقی منصوبہ ہے۔ اُس کا اتباع کرکے دنیا میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ خالق کے منصوبے کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنے فکری شاکلہ (mindset) کو جانتے ہیں اور اُسی کے مطابق، عمل شروع کردیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے کاگ (cog) کو خالق کے کاگ سے نہیں ملاتے۔ اِس بنا پر اُن کا منصوبہ غیر حقیقت پسندانہ بن جاتا ہے۔ اِس معاملے میں لوگوں کی عمومی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے۔

اِس سلسلے میں ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ خالق نے انسان کو مصلحتِ امتحان کی بنا پر مکمل آزادی (total freedom) عطا کیا ہے۔ ہر انسان کو کلی طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور

جو چاہے نہ کرے۔اِس تخلیقی نقشے کی بنا پر عملاً یہ بات ناممکن ہوگئی ہے کہ اِس دنیا میں عوام (masses) کی سطح پر کوئی آئڈیل نظام بنایا جاسکے۔ کیوں کہ کچھ لوگ اگر اُس سے اتفاق کریں گے تو کچھ لوگ اپنے اختیار کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے اس کے خلاف ہوجائیں گے اور پھر وہ مجوّزہ اجتماعی اسکیم کو درہم برہم کردیں گے۔ تاریخ میں بار بار ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جب کہ ایک شخص یا چند اشخاص نے بڑی بڑی اسکیموں کا خاتمہ کردیا۔

خالق کے اِس نقشے کی بنا پر حقیقت پسندانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی اِس سے مطابقت کرتے ہوئے اپنا نقشہ بنائے۔ ہر انسان کو پیشگی طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اس کا منصوبہ صرف اُس وقت کامیاب ہوسکتا ہے، جب کہ وہ خالق کے نقشے کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتا ہو۔ خالق کے نقشے سے ادنی انحراف بھی یقینی طور پر اس کے منصوبے کو ناکام بنادے گا، خواہ بطور خود وہ اس کو کتنا ہی زیادہ اچھا سمجھتا ہو۔

انفرادی معیار پسندی، اجتماعی عملیت

اِس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو موجودہ دنیا میں قابلِ عمل منصوبے کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ ہے فرد (individual) اور اجتماع (society) کو ایک دوسرے سے الگ کرکے منصوبہ بنانا۔ فرد کے تقاضے اور اجتماع کے تقاضے کے درمیان فرق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنانا یہی فطری طریقہ ہے۔ اِس فطری طریقے کا اصول مختصر طور پر یہ ہے:

1۔ فرد کے لیے نظری معیار (individual idealism)

2۔ اجتماع کے لیے عملی امکان (social pragmatism)

فرد کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں عامل اور معمول دونوں ایک ہوتے ہیں۔ فرد کے کیس میں ایک آدمی خود معیار مقرر کرتا ہے اور خود اس کے اپنے اختیار میں یہ ہوتا ہے کہ وہ اِس معیار کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔ اِس لیے فرد کے کیس میں کسی معیار کو عمل کی صورت دینا پوری طرح ممکن ہوتا ہے۔ اِسی لیے اللہ کے یہاں لوگوں کا درجہ فرد کی نسبت سے متعین ہوگا، نہ کہ مجموعہ کی نسبت سے۔

ہر فرد کو چاہیے کہ وہ جس اصول کو درست سمجھتا ہے، اس کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں پوری طرح اختیار کرے۔ وہ اِس معاملے میں کسی سے سمجھوتہ (compromise) نہ کرے۔ یہی وہ اصول ہے جس کو ہم نے انفرادی معیار پسندی (individual idealism) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اِس کے بعد جہاں تک اجتماع یا انسانی مجموعہ کا تعلق ہے، اس کے معاملے میں قانونِ فطرت کے مطابق، جو چیز قابلِ عمل ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ممکن الحصول اور ناممکن الحصول کے درمیان فرق کرتے ہوئے اپنا منصوبہ بنانا، یعنی ذاتی ماڈل کو چھوڑ کر عملی ماڈل اختیار کرنا، اجتماع کے درجۂ قبولیت (level of acceptance) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ یہی وہ عملی حقیقت (practical wisdom) ہے جس کو ہم نے اجتماعی عملیت (social pragmatism) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

تاریخ میں جو مفکرین عملاً ناکام ہوگئے، اُن کی ناکامی کا مشترک سبب یہی ہے کہ انھوں نے ذاتی سوچ کے تحت اپنے ذہن میں اجتماع کا ایک خوب صورت ماڈل بنایا اور پھر اس کو وقوع میں لانے کے لیے پُرشور تحریکیں شروع کردیں۔ اِس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا تصوراتی ماڈل حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر بکھر گیا— معیار (ideal) مجموعے کی سطح پر ناقابلِ حصول ہے، لیکن فرد (individual) کی سطح پر بلاشبہہ وہ قابلِ حصول ہے۔

مذہب اور سیاست

فرد اور اجتماع کے درمیان اِسی فرق کی بنا پر اسلام میں مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا۔ مذہب کا نشانہ ذاتی ارتقا (personal development) ہے، یعنی ربانی بنیادوں پر فرد کی تعمیر۔ اِس اعتبار سے، مذہب اُس دائرے کی چیز ہے جس کے لیے ہم نے انفرادی معیار پسندی (individual idealism) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اِس کے برعکس، سیاسی اقتدار کا معاملہ پورے انسانی مجموعے سے تعلق رکھتا ہے اور قانونِ فطرت کے مطابق، پورے انسانی مجموعے کو ایک معیار پر ڈھالا نہیں جاسکتا۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل

صورت صرف یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے معاملے کو اُس دائرے کی چیز قرار دیا جائے جس کے لیے ہم نے اجتماعی عملیت (social pragmatism) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

مذہب اور سیاست کے درمیان تفریق اِسی عملی اصول (practical wisdom) کی بنا پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو معیاری اصول پر قائم ہونے کی تاکید کی جائے، لیکن ذاتی اقتدار کے معاملے میں اُس اصول کو اختیار کرلیا جائے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: كماتكونون كذلك يؤمّر عليكم (البيهقي، رقم الحديث: 7391) یعنی تم جیسے ہوگے، ویسے تمھارے حکمراں ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ کہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں سماجی قبولیت (social acceptability) کو دیکھا جائے گا، نہ کہ کسی مطلق معیار (absolute ideal) کو۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اِس اصول کی بنیاد پر زندگی کی تشکیل کی جائے تو سماج میں ہمیشہ امن قائم رہے گا، کیوں کہ امن کی حالت ہر قسم کی ترقی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ اِس کے برعکس، اگر فطرت کے اِس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے اور فرد اور مجموعہ کو ایک ہی نظام کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تو ابدی طور پر امن کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اِس کے بعد سماج میں نفرت اور ٹکراؤ اور تشدد جیسی برائیاں جنم لیں گی جو کبھی ختم نہ ہوں گی۔

اسلام کا اصل نشانہ

ہر نظام میں ایسا ہے کہ کچھ چیزیں اِس نظام کا اصل حصہ (real part) ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو اِس نظام کا اضافی حصہ (relative part) ہوتی ہے۔ اسلام میں خارجی اعتبار سے، اصل نشانے کی حیثیت صرف ایک چیز کو حاصل ہے، اور وہ دعوت یا شہادت ہے۔ اس کے سوا جو خارجی چیزیں ہیں، اُن کی حیثیت اسلام کے اضافی حصہ (relative part) کی ہے۔ اسلام کو عقلی طور پر سمجھنے کے لیے اِس حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اِس حقیقت کو جانے بغیر اسلام کی جو توجیہ کی جائے گی، وہ کبھی درست نہیں ہوسکتی۔

شہادتِ عظمیٰ

اسلام کا نشانہ اقامتِ نظام نہیں ہے، بلکہ دعوت الی اللہ ہے، یعنی تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ تمام انبیا کا مشن یہی دعوت الی اللہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی دعوتی مشن کے لیے کام کیا۔ یہ دعوتی مشن پوری تاریخ میں جاری رہا۔ عالمی ابلاغ کے اعتبار سے، اِس کا کامل اظہار دورِ آخر میں ہوگا۔ اِس کامل اظہار کو ایک حدیثِ رسول میں شہادتِ عظمی کہا گیا ہے، یعنی تمام انسانیت کے سامنے اللہ کے دین کی عالمی گواہی (هذا أعظم الناس شهادة عند رب العالمين)۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس شہادت عظمی یا عالمی گواہی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطابق، وسائل دستیاب ہو چکے ہوں۔ اِس معاملے کے دو پہلے ہیں — ایک یہ کہ اِس طرح کی عالمی شہادت کے لیے عالمی مواصلات (global communication) لازمی طور پر ضروری ہے۔ بیسویں صدی میں عالمی مواصلات کے معاملے میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کو مواصلات کا زمانہ (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اِس واقعے میں اِس بات کا اشارہ ہے کہ موجودہ زمانے میں پوری طرح وہ وقت آ گیا ہے کہ شہادتِ عظمی یا عالمی دعوت کا کام موثر طور پر انجام دیا جاسکے۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف مکمل معنوں میں مذہبی آزادی آ گئی ہے اور دوسری طرف مواصلات کی ترقی نے اِس بات کو آخری حد تک ممکن بنا دیا ہے کہ کسی رکاوٹ کے بغیر عالمی دعوت کا کام کیا جاسکے۔ یہ وہی کام ہے جس کو حدیث میں 'ادخال الكلمة في كل البيوت' کہا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں دوسری بات وہ ہے جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں آیا ہے۔ شہادت عظمی کی روایت میں 'حجيج' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی مطلوب دعوت کے کام کو حجت یا دلیل کی سطح پر انجام دینا۔ یہ بھی موجودہ زمانے کی ایک خصوصیت ہے۔ چناں چہ موجودہ زمانے کو دورِ تعقل (age of reason) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں علم کی ترقی کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ عقلی ڈیٹا (rational data) کی بنیاد پر کسی بات کو مدلل کیا جاسکے۔

زمانے کی یہ تبدیلی بھی حدیث کی پیشین گوئی کے عین مطابق ہے۔موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ اسلام کی صداقت کو عقلِ انسانی کی بنیاد پر مدلل کر کے اس کو انسان کے سامنے پیش کیا جاسکے۔گویا شہادتِ عظمی کے دو تقاضے موجودہ زمانے میں پہلی بار انسان کی دسترس میں آئے ہیں— عالمی مواصلات اور عقلِ انسانی کی مسلّمہ سطح پر حقائق کا اثبات۔

حدیثِ رسول کے مطابق، دورِ آخر میں شہادت عظمی کا جو واقعہ ظہور میں آنے والا ہے، وہ حدیث کے مطابق، ایک ایسا واقعہ ہوگا جو اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔اُس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی علم عقلی ارتقا کے اعلی درجے تک پہنچ چکا ہو۔اِسی کے ساتھ وہ تمام وسائل موجود ہو چکے ہوں جو اِس طرح کی عالمی شہادت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہیں۔موجودہ زمانے میں یہ تمام وسائل پوری طرح وجود میں آچکے ہیں۔اِس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب کہ شہادتِ عظمی کا وہ واقعہ ظہور میں آئے جس کی پیشین گوئی حدیثِ رسول میں کی گئی ہے۔

خلاصہ کلام

اسلام میں انفرادی دین اور اجتماعی دین کے بارے میں یہاں جو کچھ کہا گیا، وہ اِس معاملے میں کوئی نئی اسکیم نہیں ہے۔اس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں بالفعل جو کچھ پیش آیا، یہاں اس کی ایک قابلِ قبول توجیہہ (acceptable explanation) بیان کی گئی ہے۔اِس توجیہہ کی روشنی میں اسلام کی تاریخ ایک بامعنی تاریخ بن جاتی ہے۔اِس کے بعد تاریخ کے بارے میں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ قانونِ فطرت کے مطابق ہوا اور اجتماعیات کے معاملے میں اسلام کا اصول وہی ہے جو خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، فطرت کا اصول ہے۔

یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ اسلام کی بعد کی تاریخ میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جو خالص معیار (ideal) سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔مثلاً خلیفہ یا امیر المومنین کے تقرر کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا۔بعد کے زمانے میں حکومتی ادارے کا خاندانی حکومت (dynasty) کی صورت اختیار کر لینا، اہلِ اسلام کا مختلف گروہوں میں بٹ جانا اور ان کے درمیان پر تشدد ٹکراؤ پیش آنا،

بیت المال کے نظام میں بظاہر خلل واقع ہونا، وغیرہ۔

اسلام کی بعد کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، وہ بظاہر معیار کے مطابق نہ تھے۔ اِس طرح کے واقعات کے معاملے میں عام طور پر اہلِ علم نے دو قسم کا موقف اختیار کیا ہے — ایک موقف اُن لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بعد کی تاریخ میں اسلام کا ابتدائی معیار باقی نہ رہا، وہ بگاڑ کا شکار ہوگیا۔ دوسرا موقف اُن لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خاموشی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، ہمیں اُن کا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے۔

مگر یہ دونوں موقف ناقابلِ قبول ہیں، کیوں کہ اسلام انسان کے لیے ہے اور انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہر واقعے کی عقلی توجیہہ (rational interpretation) چاہتا ہے۔ اِس لیے اسلام کی تاریخ کی ایسی توجیہہ کرنا ضروری ہے جو عقلی طور پر قابلِ فہم ہو۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں لوگ اسلام کی صداقت کے بارے میں مشتبہ ہو جائیں گے، وہ کامل یقین کے ساتھ اسلام کو اختیار نہ کر سکیں گے — مذکورہ وضاحت کا یہ فائدہ ہے کہ اِس سے اسلامی تاریخ کی ایک قابلِ فہم توجیہہ حاصل ہو جاتی ہے، بغیر اس کے کہ اسلام کی کامل صداقت پر کوئی حرف آیا ہو۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد

ہر زمانے کے اہلِ فکر ہمیشہ یہ سوچتے رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (purpose of creation) کیا ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق، تقریباً 5 ہزار سال سے انسان اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مگر اکیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک اِس کا کوئی متفق علیہ جواب انسان دریافت نہ کرسکا۔

مشہور برٹش سائنس داں سر جیمز جینز (وفات: 1946) نے اپنی کتاب پراسرار کائنات (*The Mysterious Universe*) میں لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

> It seems that man was strayed in a world that was not made for him.

اِس موضوع پر سوچنے والے لوگوں نے عام طور پر مایوسی کی باتیں کی ہیں۔ ایک روسی مصنف نے لکھا ہے کہ اِس دنیا میں ہر چیز حسین (beautiful) ہے، صرف ایک چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

ڈاکٹر الکسس کیرل نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اِس موضوع کی پیچیدگیوں کی بنا پر انھوں نے اِس کا نام انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*) رکھ دیا ہے۔ برطانی مصنف ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ جرائم کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے انسان کی ہستی پر غور کیا۔ اس نے کہا کہ میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں (I think, therefore, I exist)۔ ڈیکارٹ کے اِس قول سے صرف انسان کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ انسان کے وجود کا مقصد (purose of existence) کیا ہے۔

مشہور یونانی فلسفی ارسطو (وفات: 322 ق م) نے اِس مسئلے پر غور کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ — صرف قانونی نظام یہ کرسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے وحشیانہ سلوک سے بچائے:

The legal system alone saves people
from their own savagery.

ارسطو کو معلمِ اول کہا جاتا ہے۔ چناں چہ یہی سوچ بعد کی تاریخ میں رائج ہوگئی۔ ارسطو کی سوچ کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو اعلیٰ اوصاف کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہ اوصاف ابتدائی طور پر بالقوہ حالت میں ہوتے ہیں۔ اِس بالقوہ کو بالفعل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موافق سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) موجود ہو۔ اُس وقت کا یونانی بادشاہ سکندر اعظم (وفات: 323 ق م) ارسطو کا شاگرد تھا۔ ارسطو نے چاہا کہ بادشاہ کے تعاون سے وہ یونان میں مطلوب سیاسی اور سماجی نظام بنا سکے، مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ چناں چہ ارسطو مایوسی (despair) کی حالت میں صرف 62 سال کی عمر میں مرگیا۔

ارسطو کے نزدیک انسانی فلاح صرف صالح اجتماعی نظام کے ذریعے ممکن ہوسکتی تھی۔ ارسطو نے اپنے اس تصور کو فلسفہ کی زبان میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے اپنے اِس تصور کو فلاسفائز (philosifise) کیا۔ اِس کے ایک عرصہ بعد جرمنی میں کارل مارکس (وفات: 1883) کا دور آیا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کو اقتصادی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مارکس نے اِس تصور کو سیکولرائز (secularise) کیا۔ مگر کارل مارکس، عالمی کمیونسٹ پارٹی اور اِس تصور پر بننے والی سوویت ریاست (USSR) سب کی سب، اپنے اجتماعی نشانے کے حصول میں مکمل طور پر ناکام ہوگئے۔

اِس کے بعد یہ فکری منہج مسلمانوں کے درمیان رائج ہوا۔ عرب دنیا میں سید قطب (وفات: 1966) اور برصغیر ہند میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (وفات: 1979) پیدا ہوئے۔ اِن لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس فکری منہج کو اسلام میں داخل کردیا۔ انھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر بیان کی۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے لیے اس کے مطابق، سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے

قیام کو ضروری قرار دیا — ارسطو نے اِس تصور (concept) کا فلسفیانہ ایڈیشن تیار کیا تھا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کا سیکولر ایڈیشن بنایا اور سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اِس تصور کا اسلامی ایڈیشن تیار کر دیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے ڈھائی ہزار سال کے دوران یہ نظریہ کبھی بھی واقعہ نہ بن سکا۔ کبھی کسی ملک میں ایسا نہیں ہوا کہ مصلح کے بیان کردہ نشانے کے مطابق، کوئی اجتماعی نظام یا کوئی سماجی نظام قائم ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اِس نظریے کے تمام علم بردار آخر کار مایوسی کی حالت میں مرے، وہ دنیا کو اپنے تصور کے مطابق، مطلوب نظام نہ دے سکے۔

اِس سے بھی زیادہ تلخ بات یہ ہے کہ اِس قسم کے تمام نام نہاد مصلحین کا انجام یہ ہوا کہ وہ تعمیر کے نام پر اٹھے اور دنیا کو عملاً تخریب کا تحفہ دے کر چلے گئے۔ ارسطو کے شاگرد سکندر اعظم نے ساری دنیا کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ کارل مارکس کے ماننے والوں نے اپنا مفروضہ نظام قائم کرنے کے نام پر روس میں 25 ملین انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کے نتیجے میں مختلف ملکوں میں اپنے مطلوب نظام کے قیام کے لیے مسلح جدوجہد (armed struggle) شروع ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

اجتماعی اصلاح کی اِن تحریکوں کا یہ منفی انجام کیوں ہوا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی نظام کا تعلق براہِ راست سیاسی اقتدار سے ہے۔ جب بھی آپ کسی ملک میں اپنی پسند کا اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے اٹھیں گے تو وہاں لازماً اُن لوگوں سے آپ کا ٹکراؤ پیش آئے گا جو بروقت سیاسی اقتدار پر قابض ہیں۔ اِس طرح اجتماعی نظام کا نظریہ اول دن سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

سیاسی ٹکراؤ کوئی سادہ بات نہیں۔ سیاسی ٹکراؤ کا طریقہ عین اپنے نتیجے کے طور پر انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسلام کے پولٹکل مفسرین کے الفاظ میں، ایک، ''طاغوت'' اور دوسرے، مخالفِ طاغوت۔ مخالفِ طاغوت گروہ اپنی تحریک کو پہلے قائم شدہ حکومت کے مقابلے میں اپوزیشن کے طور پر شروع کرتا ہے۔ آغاز میں یہ کام بظاہر پُرامن طور پر شروع ہوتا ہے، لیکن جب پُرامن ذریعہ

ناکام ہوجاتا ہے تو اس کے بعد دھیرے دھیرے قائم شدہ حکومت کے خلاف تشدد شروع ہوجاتا ہے، پھر جب تشدد سے بھی مطلوب کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو اس کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر خودکش بم باری شروع کردی جاتی ہے۔ اجتماعی انقلاب کا نتیجہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر صرف اجتماعی ہلاکت بن کر رہ جاتا ہے۔

اِس معاملے میں تباہ کن ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی انقلاب کا نظریہ اپنے آپ میں ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس دنیا میں کوئی ایسا نظریہ کبھی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا جو خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہو۔

خالق کا نقشۂ تخلیق

خالق کا نقشۂ تخلیق (creation plan) کیا ہے۔ اس کو جاننے کا واحد مستند ذریعہ صرف قرآن ہے۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے انسان کو جس نقشے کے مطابق، پیدا کیا ہے، وہ کسی مفروضہ اجتماعی نظام پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر انفرادی اصلاح کے تصور پر مبنی ہے۔ خالق نے دنیا میں اپنی اسکیم کو برروئے کار لانے کے لیے ہر دور میں پیغمبر بھیجے۔ اِن تمام پیغمبروں کا نشانۂ دعوت ہمیشہ فرد (individual) ہوا کرتا تھا، نہ کہ کسی قسم کا سوشیو پولٹکل سسٹم (socio-political system) خالق کا اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، اصل کنسرن (concern) یہ نہیں ہے کہ دنیا میں اجتماعی سطح پر کوئی آئڈیل نظام بنایا جائے۔ خالق کا نشانہ فرد سازی ہے، مجتمع سازی نہیں، کیوں کہ تخلیقی نقشے کے مطابق، مجتمع سازی آئڈیل معنوں میں ممکن ہی نہیں۔ آئڈیل نظام یا آئڈیل سماج صرف جنت میں قائم ہوسکتا ہے۔ موجودہ دنیا کی حیثیت انتخابی میدان (selection ground) کی ہے۔ خالق کی منشا یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایسے اعلیٰ افراد چنے جائیں جو آخرت کی ابدی جنت میں بسائے جانے کے مستحق ہوں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے قرآن کی سورہ البقرہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیتوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

’’اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ''۔ (2:30-31)

اللہ تعالی نے جب انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ زمین کو اِس آزاد مخلوق کے چارج میں دے دے، اُس وقت فرشتوں نے یہ شبہہ ظاہر کیا کہ آزادی پا کر انسان زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ فرشتوں کا یہ شبہہ بے بنیاد نہ تھا۔ خود قرآن کے بیان سے ثابت ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں جب قرآن اترا تو اللہ تعالی نے اس میں یہ آیت شامل فرمائی: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جب بطور واقعہ وہی ہوا جس کا شبہہ فرشتوں نے ظاہر کیا تھا، تو پھر اللہ نے اولادِ آدم کو کیوں پیدا کیا اور کیوں اُن کو زمین پر بسنے کا موقع دیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، آدم کی پیدائش سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول تک جب کہ قرآن نازل ہوا، ہر قوم اور ہر بستی میں مسلسل طور پر اللہ کی طرف سے نذیر (بتانے والے) آتے رہے، اس کے باوجود آدم کی بعد کی نسلوں میں پیدا ہونے والے لوگوں کی اکثریت مفسد ثابت ہوئی، حتی کہ پوری تاریخ فساد سے بھری ہوئی تاریخ بن گئی۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ اِس سوال کا جواب قرآن کی مذکورہ آیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آدم کو اُن کی اولاد کے نام (أسماء) بتائے۔ یہاں علمِ اسماء سے مراد علمِ مسمّیات ہے۔ یہاں اسم سے مراد افراد کے نام (names) نہیں، بلکہ یہاں اسم سے مراد مُسمّیٰ (named) ہے، یعنی نام سے موسوم افراد۔ دوسری بات یہ کہ اُس وقت آدم کے سامنے اللہ نے اُن کی اولاد کے جن لوگوں کو پیش کیا، وہ پوری ذریتِ آدم یا پورا مجموعۂ انسانی نہ تھا۔ کیوں کہ اگر تمام

پیدا ہونے والے انسان اُن کے سامنے پیش کیے جاتے تو فرشتوں کا شبہہ رفع نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ اِس قسم کے مظاہرے سے فرشتوں کے شبہہ کی تصدیق ہوجاتی۔ کیوں کہ خود قرآن کی تصدیق کے مطابق، پیدا ہونے والے انسانوں کی عظیم اکثریت عملاً مفسد ثابت ہوئی۔

اِس پہلو پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالی نے اُس وقت پوری اولادِ آدم کو نہیں بلکہ صرف اولادِ آدم کے منتخب افراد کو پیش کیا تھا۔ یہ منتخب افراد وہی تھے جن کو قرآن میں دوسرے مقام پر نبی اور صدیق اور شہید اور صالح کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے (4:69)۔ یہ مظاہرہ اللہ تعالی نے صرف فرشتوں کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ بالواسطہ طور پر اُس کا مخاطب وہ انسان بھی تھے جو اللہ کے مقصدِ تخلیق کو سمجھنا چاہتے ہوں۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کی سورہ الملک کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2)۔ اِس آیت سے اور قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سے اللہ تعالی کا مقصود احسن العمل افراد ہیں، پورے مجموعۂ انسانی میں عدل اور فلاح کا نظام قائم کرنا منصوبہ الٰہی کا نشانہ نہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ خالق نے جس نقشے کے تحت انسان کو پیدا کیا، اس میں ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اِس منصوبۂ تخلیق کے مطابق، ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی تھی۔ ہر انسان کے لیے کامل معنوں میں آزادانہ انتخاب (fredom of choice) کا موقع کھلا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات تھی کہ لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں اور اِس طرح اکثر لوگ عملاً مفسد بن جائیں۔ اِس بنا پر اللہ تعالی نے ایک قابلِ عمل نشانے کا انتخاب کیا، یعنی اپنے منصوبہ تخلیق کو مبنی بر فرد کے اصول پر قائم کرنا، نہ کہ مبنی بر مجموعہ کے اصول پر۔ اللہ تعالی کے مقرر کردہ نقشہ تخلیق کے مطابق، اب جو ہورہا ہے، وہ یہ کہ زمین پر کامل معنوں میں آزادی کا ماحول ہے۔ لوگ ایک کے بعد ایک پیدا ہورہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی فرد اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کوئی غلط استعمال۔ عین اُسی وقت ایک غیبی نظام کے تحت فرشتے ہر ایک کا پورا ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ اُس وقت

جو ہوگا، اس کو قرآن میں پیشگی طور پر مختلف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے: فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (42:7) یعنی ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

تخلیق کے اِس تصور کے مطابق، آخرت میں یہ ہوگا کہ پوری نسلِ انسانی سے صالح افراد چنے جائیں گے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے یہ ثبوت دیا تھا کہ آزادی کے باوجود انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کیا۔ آزادی کے باوجود وہ کامل معنوں میں با اصول زندگی کے پابند رہے، آزادی کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح بے راہ روی سے بچایا۔ اِس طرح انھوں نے ثابت کیا کہ وہ جنت کے آئڈیل معاشرے میں بسائے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آخرت میں پوری تاریخ بشری کے اِن منتخب افراد کو جنت کے معیاری معاشرے میں بسا دیا جائے گا، اور بقیہ لوگ جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے میں ناکام رہے، اُن کو دوسرے انسانوں سے الگ کرکے کائناتی کوڑا خانہ (universal litterbin) میں ڈال دیا جائے گا، جس کا دوسرا نام جہنم ہے۔

خلافت کا تصور

قرآن کی سورہ البقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے جب انسان کو پیدا کیا تو اللہ اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اِس مکالمے کے دوران اللہ نے انسان کی پیدائش کا مقصد اِس طرح بیان کیا: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً (2:30) یعنی یاد کرو اُس وقت کو جب کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

'خلافت' کے لغوی معنی ہیں: بعد کو آنا۔ 'خلیفہ' کا مطلب ہے: کسی کے بعد اس کی جگہ پر آنے والا، یعنی جانشین (successor)۔ خلیفہ کا اصل لفظی مطلب یہی ہے، لیکن اِس طرح کسی کے بعد جو شخص جانشین بنتا ہے، وہ عام طور پر صاحبِ اقتدار ہوتا ہے، اس لیے استعمال میں خلیفہ کا لفظ مجرد طور پر صاحبِ اقتدار کے لیے بولا جانے لگا، خواہ ایسا شخص جانشین کے طور پر صاحبِ اقتدار بنا ہو یا جانشینی کے بغیر اس کو یہ پوزیشن حاصل ہوگئی ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں خلیفہ کا لفظ اسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر ایک با اختیار مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا۔ ایک عارضی مدت کے لیے زمین انسان کے چارج میں دے دی گئی۔ نظامِ فطرت کے مطابق، اگر چہ زمین کا انتظام انسان چلا رہے ہیں جس طرح کائنات کے دوسرے حصوں کا انتظام فرشتے چلا رہے ہیں۔ لیکن محدود معنی میں زمین انسان کے چارج میں ہے۔ قیامت تک کے لیے انسان کو کامل اختیار ہے کہ وہ اپنے دائرے میں زمین پر آزاد مخلوق کی حیثیت سے زندگی گزارے، خواہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا غلط استعمال۔

قرآن فہمی کا ایک اصول یہ ہے: القرآن یفسر بعضُہ بعضا (قرآن کا ایک حصہ اُس کے دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے)۔ اِس اصول کے مطابق، غور کیا جائے تو قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کو خلیفہ بنانے کا مطلب کیا ہے۔ اُن میں سے ایک آیت یہ ہے: ثُمَّ جَعَلْنَٰكُمْ خَلَٰٓئِفَ فِى ٱلْأَرْضِ مِنۢ بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (10:14)۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالی نے ایک کامل مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے، پہلا انسان اتنا ہی کامل تھا، جتنا کہ اکیسویں صدی کا انسان۔ لیکن جس سیارہ ارض (planet earth) پر انسان کو بسایا گیا، وہاں تمام چیزیں موجود تھیں، لیکن یہ چیزیں زیادہ تر بالقوہ (potential) طور پر موجود تھیں۔ اب یہ انسان کا کام تھا کہ وہ اِس بالقوہ کو بالفعل (actual) بنائے۔ پوری انسانی تاریخ اِس معاملے کی تصویر ہے۔ وہ بالقوہ سے بالفعل کی طرف سفر کر رہی ہے۔

اِس سفر کے لیے انسانی زبان میں سب سے زیادہ موزوں لفظ تہذیب ہے۔ پوری انسانی تاریخ، آدم سے لے کر قیامت تک، اِسی تہذیبی سفر کا دوسرا نام ہے۔ خالق نے کرہ ارض کو تہذیب کے مقام یا مقر (abode of civilization) کے طور پر بنایا۔ انسان کا کام یہ تھا کہ وہ اِس پوٹنشیل تہذیب (potential civilization) کو ایکچول تہذیب (actual civilization) کی صورت میں ڈیولپ کرے — اِسی رول کو انجام دینے والے کا نام خلیفہ ہے، خواہ وہ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان۔

تہذیب کا لفظ عام طور پر مادی ترقی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ معروف تصور کے مطابق، تہذیب کا مطلب ہے — سوشل، کلچرل اور سائنٹفک ترقی کا اعلی مرحلہ۔ مگر تہذیب کی یہ تعریف ایک محدود تعریف ہے۔ تہذیب کے تصور کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ چوں کہ تہذیب کے معمار خود سے کوئی چیز تخلیق نہیں کرتے، وہ خالق کے پیدا کردہ ذرائع (natural resources) یا انفراسٹرکچر کو استعمال کرتے ہوئے تہذیب کا سفر جاری کرتے ہیں۔ گویا کہ تہذیب کے تمام انسانی معمار، خالق کے کارندے ہیں۔ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کو واقعے کی صورت دے رہے ہیں۔

تہذیب کا یہ سفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ربانی تہذیب کا سفر ہے۔ وہ انسان کو اُس منزل کی طرف لے جانے والا ہے جہاں وہ حمدِ الہی اور شکرِ خداوندی کا اعلی تجربہ کرے، جہاں وہ ربانی معرفت کے اعلی مراتب کو حاصل کر سکے۔ مگر یہ کام چوں کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے انجام دیا جارہا ہے، اِس لیے لوگ اس کی معنویت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ تہذیب کے اِس سفر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ

آدمی انسانی آزادی سے پیدا ہونے والی خرابیوں (evils) کو الگ کرکے یہ دیکھ سکے کہ خدا کس طرح انسانی تاریخ کو مینیج کر رہا ہے۔انسانی تاریخ کو بامعنی طور پر سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مبصر،انسانی عنصر کو الگ کرکے تاریخ میں عمل کرنے والے خدائی عنصر کو دیکھ سکے۔

ایک جائزہ

اللہ نے انسان کو کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔یہ آزادی اِس لیے ہے تاکہ انسان خود سے چیزوں کو دریافت کرے، وہ اپنے اندر ایک خود تعمیر کردہ شخصیت (self-developed personality) بنائے۔انسان کبھی اپنی آزادی کو صحیح استعمال کرتا ہے اور کبھی غلط استعمال۔لیکن اللہ اپنی قوتِ قاہرہ کے ذریعے تاریخ کو مینیج کرتے ہوئے اُس کو اُس منزل کی طرف لے جارہا ہے جو اس کی اصل منزل ہے، یعنی معرفتِ خداوندی(realization of God) کی تکمیل۔

اللہ نے انسانیت کے آغاز سے پیغمبروں کو بھیجنے کا جو سلسلہ جاری کیا، وہ اِس لیے تھا کہ پیغمبر، انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبے سے باخبر کریں اور یہ کوشش کریں کہ انسانی تہذیب کا سفر صحیح رخ (right direction) میں جاری رہے۔مگر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کو استعمال کرنے میں زیادہ ذمے دار ثابت نہیں ہوا۔ بہت جلد ایسا ہوا کہ تاریخ عمومی طور پر توحید کے راستے سے ہٹ کر شرک کے راستے پر چل پڑی۔اس کا سبب یہ تھا کہ انسان نے پایا کہ پیغمبر جس اللہ کی خبر دے رہے ہیں، وہ اللہ اس کو دکھائی نہیں دیتا، البتہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات ہر طرف دکھائی دے رہی ہیں۔اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے نہ دکھائی دینے والے خدا کو چھوڑ کر، دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا خدا سمجھ لیا۔

یہ واقعہ کس طرح ہوا، اس کا اشارہ قرآن کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ (6:78) یعنی ہر وہ چیز جو بظاہر بڑی (great) دکھائی دے، اس کو خدا یا شریکِ خدا سمجھ لینا۔اِسی سے قدیم تاریخ میں شرک کی وہ صورت پیدا ہوئی جس کو مظاہر فطرت کی پرستش (nature worship) کہا جاتا ہے۔فطرت پرستی کا یہ نظریہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔اِس کا سبب یہ تھا کہ پچھلے زمانے کے تمام بادشاہ فطرت پرستی کو اپنے لیے موزوں (convenient) سمجھ کر اس مذہب کی سرپرستی کرنے لگے۔

انھوں نے اِسی مشرکانہ مذہب سے اپنے لیے حق حکم رانی (mandate) لینا شروع کردیا۔ اِس طرح ایسا ہوا کہ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں شرک کو سرکاری مذہب (official religion) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شرک اور سیاسی اقتدار کے اِسی تعلق (nexus) کے نتیجے میں قدیم زمانے میں شرک کو ساری دنیا میں دبدبہ حاصل ہوگیا۔ شرک کا یہ دبدبہ مذہبِ توحید کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ شرک کے اِسی دبدبے کو قرآن میں فتنہ (8:29) کہا گیا ہے۔

شخصی حکومت

قدیم زمانے میں ہزاروں سال سے ساری دنیا میں حکومت کا وہ نظام قائم تھا جس کو شخصی بادشاہت (Monarchy) کہا جاتا ہے۔ شخصی بادشاہت بہت جلد شخصیت پرستی (personality cult) میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ اور پھر شخصیت پرستی رفتہ رفتہ بت پرستی (idol worship) کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایسا ہوا کہ شخصی حکومتیں آخر کار مشرکانہ حکومتیں بن گئیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے معاصر بادشاہ فرعون نے کہا کہ: أنا ربکم الأعلى (79:24)۔

قدیم زمانے میں شخصی حکومت کا نظام سب سے بڑی برائی (greatest evil) بن کر ابھرا۔ یہ انسانی آزادی کا سب سے زیادہ سنگین استعمال تھا۔ دنیا میں اِس نظام کو جمہوری انقلاب کے ذریعے سیاسی طور پر ختم کیا گیا۔ آخرت میں باعتبارِ حقیقت اُس کی مجرمانہ حیثیت کا اعلان کیا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يقبض الله تبارك وتعالى الأرض يوم القيامة ويطوي السماء بيمينه ثم يقول أنا الملك، أين ملوك الأرض (صحیح مسلم، رقم الحديث: 4994)۔

خلافت کے تین دور

قرآن میں خلافت کے معنیٰ ''اسلامی خلافت'' کے نہیں ہیں۔ قرآن کے مطابق، وہ تمام لوگ خلائف في الأرض (10:14) ہیں جن کو مختلف زمانوں میں بااختیار رول ملا، خواہ وہ اپنے عقیدے کے اعتبار سے، مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔ تاریخ میں جن لوگوں کو باری باری خلافتِ ارضی کا

رول ادا کرنے کا موقع ملا، اُن کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ مشرکین کی خلافت — یہ دور قدیم زمانے سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔

2۔ موحدین کی خلافت — یہ مسلم سلاطین کا دور ہے۔ یہ دور تقریباً آٹھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک قائم رہا۔

3۔ سیکولر لوگوں کی خلافت — یہ دور انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور اب تک قائم ہے۔

قدیم زمانے میں جن مشرک گروہوں کو خلافتِ ارضی کا رول ادا کرنے کا موقع ملا، انھوں نے اپنی آزادی کا نہایت غلط استعمال کیا۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ناحق طور پر ساری دنیا میں جبر کی حکومت (despotic rule) کا نظام قائم کر دیا۔ اِس دور میں انسان کو مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔ اِس دور میں ہر جگہ وہ کلچر قائم تھا جس کو مذہبی تشدد کا دور کہا جاتا ہے۔

اِس مشرکانہ دور میں آزادانہ سوچ (free thinking) کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر فکری ارتقا کا عمل پوری طرح ختم ہو گیا تھا۔ علم کی ترقی عملاً ناممکن ہو گئی تھی۔ اِس کا ایک شدید نقصان یہ تھا کہ فطرت (nature) میں تحقیق کا کام پوری طرح رک گیا تھا۔ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ انسان فطرت میں چھپے ہوئے قوانین کو دریافت کرے، تاکہ انسان پر اعلیٰ معرفت کے دروازے کھلیں، دعوتی عمل کو زیادہ موثر طور پر انجام دینا ممکن ہو جائے۔ مگر مشرکانہ اقتدار کے زمانے میں اِس قسم کا عمل پوری طرح بند ہو گیا تھا۔ اللہ نے کثیر تعداد میں پیغمبر بھیجے، تاکہ وہ انسان کو بتائیں کہ وہ اپنی آزادی کو غلط استعمال کر کے اللہ کے منصوبے میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ لیکن پیغمبروں کی پُر امن دعوتی کوشش عملاً غیر موثر ہو گئی۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے تخلیقی منصوبے کی بنا پر انسان کی آزادی کو تو ختم نہیں کیا، البتہ یہ فیصلہ کیا کہ خلافتِ ارضی کا رول مشرکین سے چھین لیا جائے اور اس کو موحدین کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی خدائی فیصلہ تھا جس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:29)۔ قرآن کی اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہو گی کہ دورِ شرک اپنے وجود کا جواز ختم کر چکا ہے، اس کو توڑ کر دورِ توحید کا آغاز کرو،

تاکہ انسان کے اوپر اللہ کی ابدی رحمتوں کے دروازے کھلیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اور آپ کے پیروؤں نے واقعتاً ایسا ہی کیا۔ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں نے دورِقدیم کی تقریباً پوری آباد دنیا میں وہ کام کیا جس کو ایک مبصر نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے کہ — پیغمبر اور اُن کے پیروؤں نے قدیم زمانے کے پورے سیاسی نقشے کو بدل دیا۔

اِس طرح خلافتِ ارضی کا رول مسلمانوں یا موحدین کے ہاتھ میں آ گیا۔ مسلمانوں نے اِس عہد میں جو رول ادا کیا، وہ کوئی نظام قائم کرنا نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام قائم کرنا امتِ مسلمہ کا نشانہ ہی نہیں۔ مسلم عہد میں جو کام انجام پایا، اس کے دو بڑے پہلو تھے — ایک تھا دنیا میں آزادی کا دور لانا اور دوسرے، علومِ فطرت کے انکشاف کا دروازہ کھولنا۔

قرآن میں کہا گیا تھا کہ: أمرهم شورى بينهم (42:38)۔ یہ آیت کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ اِس آیت میں دراصل ایک مطلوب عالمی انقلاب کی خبر دی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ دنیا سے شخصی حکومت کا دور ختم ہو اور اس کے بجائے جمہوری حکومتوں کا دور آئے، تاکہ انسان کو یہ موقع ملے کہ وہ آزادی کے ساتھ سوچ سکے، تاکہ انسان کے پوٹنشیل کی انفولڈنگ ہو، تاکہ انسان کو فطرت کے رموز کی دریافت کا موقع ملے، تاکہ ربانی تہذیب کو قلم بند کرنے کا وہ دور شروع ہو جس کا ذکر قرآن میں اِن شاہانہ الفاظ میں کیا گیا ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (31:27)

جمہوریت کا دور

دورِ جمہوریت دراصل دورِ آزادی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، زمین پر آزادانہ ماحول کا باقی رہنا بے حد ضروری ہے۔ انسان سے جو رول مطلوب ہے، وہ صرف آزادی کے ماحول میں ممکن ہے۔ جمہوریت کا یہ دور مسلم عہد میں شروع ہوا۔ وہ پراسس کے روپ میں آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ 1789 میں انقلابِ فرانس کی صورت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

جمہوریت (democracy) انسانی تاریخ کا ایک عظیم مرحلہ ہے۔ اِس دور میں پہلی بار

ایسا ہوا ہے کہ آزادی اور امن انسان کا اپنا چوائس (choice) بن گیا ہے۔ اِس سے پہلے ایسا تھا کہ کسی انسان کو آزادی اور امن صرف اُس وقت ملتا تھا، جب کہ حاکمِ وقت اس کو بطور عطیہ اُسے دے دے۔ اب یہ معاملہ کسی دینے والے کا عطیہ نہیں رہا، بلکہ وہ ہر انسان کا مطلوب حق (absolute right) بن چکا ہے۔ کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اِس حق کو آپ سے چھین لے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے لوگ ملیں گے جو یہ شکایت کریں گے کہ اُن کو آزادی اور امن کے ماحول میں کام کرنے کے مواقع حاصل نہیں۔ ایسے لوگ بلاشبہہ زندگی کے راز سے بے خبر ہیں۔ موجودہ زمانے میں آزادی اور امن کی جو نعمت ملی ہے، اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اِس حکمت کو جانے کہ اس کو اپنے عمل کے لیے ایسا نشانہ مقرر کرنا ہے جو دوسرے سے ٹکراؤ کیے بغیر جاری کیا جا سکے۔ اگر آپ اپنے لیے ایسا نشانہ مقرر کریں جو دوسروں کی زندگی میں خلل ڈالنے والا ہو تو آپ کے حصے میں صرف شکایت اور پروٹسٹ آئے گا، لیکن اگر آپ اپنے عمل کے لیے ایسا نشانہ مقرر کریں جو کسی حال میں دوسروں کے لیے مسئلہ (problem) نہ بنے، تو آپ ساری عمر کام کرتے رہیں گے اور کبھی آپ کو دوسروں کے خلاف شکایت نہ ہوگی۔

یہی وہ راز ہے جو قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے: الصلح خیر (4:128)۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسا نشانہ مقرر کرو جس میں دوسروں سے ٹکراؤ نہ پیش آتا ہو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تمھارے لیے اِس دنیا میں خیر ہی خیر ہوگا۔ تمھارے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ تم دوسروں کے خلاف شکایت سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے کام کو مکمل کرو۔ جو آدمی شکایت کی زبان بولے، وہ صرف یہ اعلان کررہا ہے کہ اس نے اپنے لیے غلط نشانے کا انتخاب کیا تھا۔ یہ معاملہ خود اپنے نشانے کی غلطی کا معاملہ ہے، نہ کہ دوسروں کے ظلم یا دشمنی کا معاملہ۔

مسلم دورِ سلطنت میں دوسرا جو بڑا کام ہوا، وہ یہ کہ فطرت کو پرستش کے موضوع سے ہٹا کر تحقیق کا موضوع بنا دیا گیا۔ یہ عمل بھی تدریجی طور پر جاری ہوا اور آخر کار اُس علمی انقلاب تک پہنچا جس کو سائنسی انقلاب (scientific revolution) کہا جاتا ہے۔ اِس سائنسی انقلاب نے اُس پیشین گوئی کو

واقعہ بنادیا جس کی خبر قرآن میں اِن الفاظ میں دی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔موجودہ زمانے میں جمہوری انقلاب اور سائنسی انقلاب کی صورت میں جو انقلابات ظہور میں آئے، وہ پوری طرح اسلام کے حق میں تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید دور (modern age) پورے معنوں میں ایک موافقِ اسلام دور ہے۔اِس دور کا آغاز مسلمانوں کے سیاسی عروج کے زمانے میں ہوا، لیکن اِس دور کی تکمیل تاریخ کے اُس تیسرے دور میں ہوئی جس کو اوپر کی تقسیم میں ''سیکولر لوگوں کی خلافت'' کہا گیا ہے۔

امتِ مسلمہ کا نیا رول

قرآن کی سورہ آل عمران میں فطرت کے ایک اصول کو اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (3:26) یعنی تم کہو، اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے، سلطنت دے اور جس سے چاہے، سلطنت چھین لے۔اور تو جس کو چاہے، عزت دے اور جس کو چاہے، ذلیل کرے۔تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خلافتِ ارضی کسی گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں۔یہ ایک رول ہے جس کو اللہ اپنے منصوبے کے تحت کبھی ایک گروہ کو دیتا ہے، کبھی دوسرے گروہ کو۔جب کسی گروہ کو خلافتِ ارضی ملے تو اس کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ اس کو یہ رول کس مقصد کے لیے دیا گیا ہے۔اور جب اُس سے خلافتِ ارضی چھین لی جائے تو اُس وقت بھی اس کو جاننا چاہئے کہ یہ منصب کیوں اُس سے چھینا گیا۔اِس حقیقت سے بے خبری کا یقینی نقصان یہ ہے کہ متعلقہ گروہ کو اللہ کی نصرت نہ ملے اور نتیجۃً وہ ہر اعتبار سے ناکام ہو کر رہ جائے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں مسلم ایمپائر قائم ہوا۔یہ اِس بات کی علامت تھی کہ اب خلافتِ ارضی کا رول مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔وہ رول یہ تھا کہ دنیا سے قدیم طرز کی بادشاہت (kingship) کا خاتمہ کر دیا جائے۔یہ کام مسلمانوں کے ذریعے عالمی پیمانے پر انجام پایا۔صدیوں تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ

جس ملک میں داخل ہوئے، وہاں انھوں نے قدیم طرز کی سیاسی آمریت کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن پھر وہ وقت آیا کہ مسلم سلطنتوں کا زوال شروع ہوا۔ انیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کے سیاسی غلبے کے خاتمے کا اعلان تھا۔ پوری دنیا میں ایک کے بعد ایک، مسلم سلطنتیں مغربی اقوام سے مغلوب ہو کر رہ گئیں۔ اِس کے بعد مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر یہ کوشش کی کہ وہ اپنی سیاسی عظمت کو دوبارہ حاصل کرسکیں، لیکن دوسوسالہ جدوجہد کے باوجود وہ اپنی ان کوششوں میں مکمل طور پر نا کام رہے۔

یہ کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ عملاً مسلمانوں کے رول میں تبدیلی کا اعلان تھا۔ اٹھارھویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی رول ختم ہو چکا تھا۔ اب اُن سے جو رول مطلوب تھا، وہ دوسرا رول تھا، اور وہ تھا — جدید امکانات کو استعمال کر کے عالمی سطح پر دینِ خداوندی کی اشاعت۔ دورِ جدید میں اللہ نے اپنی مصلحت کے تحت اہل مغرب کو یہ موقع دیا کہ وہ نئے وسائل کی دریافت کر کے اُن کو عام کریں۔ اہلِ مغرب کے ذریعے دنیا میں پہلی بار وہ چیزیں آئیں جو عالمی دعوت کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً مذہبی آزادی، کھلا پن، عالمی آمد ورفت، پرنٹنگ پریس، عالمی کمیونکیشن، وغیرہ۔

یہ نئے حالات اِس بات کا اشارہ تھے کہ اب امتِ مسلمہ کا رول بدل گیا ہے۔ اب اُن کا رول یہ ہے کہ نئے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وہ اسلام کے فطری پیغام کو تمام قوموں اور تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ تقریباً پوری امت اِس عظیم حقیقت سے بے خبر رہی۔ انھوں نے رول کی اِس تبدیلی کو نہیں سمجھا۔ وہ اپنی گزری ہوئی سیاسی عظمت کی واپسی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑائی کرتے رہے۔ یہ عمل خدائی منصوبے کے خلاف تھا، اِس لیے اس کو خدا کی مدد حاصل نہیں ہوئی اور وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ امتِ مسلمہ کے اِس نئے رول کو حدیث میں بطور پیشین گوئی اِن الفاظ میں بیان کر دیا گیا تھا:

لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر و لا وبر إلا أدخله الله کلمة الإسلام -

رول کی تبدیلی

انیسویں اور بیسویں صدی نے امت مسلمہ کو ایک نئے دور میں پہنچا دیا۔ نئے دور کے حالات بتا رہے تھے کہ امتِ مسلمہ کا رول اب بدل گیا ہے اور وہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے — عالمی دعوت۔

مگر نئے دور کے مسلم رہنما نا قابلِ فہم طور پر جدید دور سے بے خبر رہے۔ چناں چہ وہ امتِ مسلمہ کو اس کا نیا رول بھی نہ بتا سکے۔ نئے دور میں امتِ مسلمہ کی بہت بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ امت دورِ جدید میں اپنے اِس نئے رول سے بے خبر ہوگئی ۔اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت کا کیس اُس قوم کا کیس بن گیا جو اپنی سمتِ سفر (direction) سے بے خبر ہوگئی ہو۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ امت اپنے دورِ زوال میں پہنچ چکی تھی ۔اِس دور میں امت کے تقریباً تمام رہنماؤں نے ایک ہی کام کیا، وہ ایسی باتیں لکھنے اور بولنے لگے جو امت کی زوال یافتہ نفسیات سے مطابقت رکھتی تھی، لیکن وہ یقینی طور پر خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف تھی ۔انیسویں صدی اور بیسویں صدی امتِ مسلمہ کے لیے زبردست سرگرمیوں کی صدی ہے، مگر یہ سرگرمیاں خود ساختہ قومی رول کے لیے تھیں، نہ کہ خدا کے مطلوب رول کے لیے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت اپنی سرگرمیوں میں خدا کی نصرت سے محروم ہوگئی۔اِس دور میں اُس نے جو نشانے مقرر کیے، وہ سب قومی نشانے تھے جو زوال یافتہ نفسیات کے تحت بنے تھے۔اِس بنا پر اِن نشانوں کے لیے یہی مقدر تھا کہ وہ پورے نہ ہوں ۔

اِس قومی ناکامی کے بعد دوسری زیادہ بڑی ناکامی سامنے آئی، وہ یہ کہ پوری امت منفی نفسیات میں مبتلا ہوگئی— مایوسی، منفی سوچ، شکایت اور پروٹسٹ کا ذہن، مشتعل مزاجی ،تشدد، ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھ لینا، ہر طرف سازش دکھائی دینا، گن کلچر اور بم کلچر اور آخر میں احساس ناکامی کی بدترین صورت، یعنی خودکش بم باری۔اکیسویں صدی میں امتِ مسلمہ کی یہ ایک عمومی تصویر ہے۔اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ پوری قوم تشدد کی نفسیات میں مبتلا ہوگئی، اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگوں کا کیس فعال تشدد (active violence) کا کیس ہے اور کچھ لوگوں کا کیس منفعل تشدد (passive violence) کا کیس ہے۔

یہ ایک عمومی بربادی کی حالت ہے۔امت کو اس بربادی سے نکالنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے اندر سے منفی سوچ کو مکمل طور پر ختم کیا جائے اور اس کے اندر مکمل طور پر مثبت سوچ (positive thinking) لائی جائے،اس کو تیار کیا جائے کہ وہ دوبارہ اپنے اصل مشن پر کھڑی ہوجائے، یعنی دعوت الی اللہ کا مشن۔اِس معاملے میں کوئی بھی عذر (excuse) قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

دعوہ ایمپائر

قدیم زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم تھا۔ آج بھی تمام مسلمان اِسی ماضی کی واپسی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ بات (anachronism) ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تاریخ کے بارے میں اللہ کے منصوبے کو سمجھیں اور اس کے مطابق، اپنے عمل کا نقشہ بنائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سیاسی ایمپائر بنانے کا زمانہ ختم ہوگیا، لیکن امتِ مسلمہ کے لیے ایک اور زیادہ بڑا موقع پوری طرح کھل چکا ہے اور وہ ہے پُرامن اسلامی دعوت کا عالمی ایمپائر قائم کرنا۔ اِس قسم کے دعوہ ایمپائر کا امکان ایک حدیثِ رسول میں پیشگی طور پر بتادیا گیا ہے۔ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: کلمة واحدة تعطونها، تملكون بها العرب، وتدين لكم بها العجم (البداية والنهاية: 3/123) یعنی میں تم کو ایک ایسے کلمہ کی طرف بلاتا ہوں جس کے ذریعے تم عرب کے مالک بن جاؤگے اور عجم تمھاری اطاعت کریں گے۔

قدیم زمانے میں سیاسی ایمپائر بنانے کے لیے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، لوگوں کو جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں، مگر آج اسلام کا دعوہ ایمپائر یا آئڈیالاجکل ایمپائر بنانے کے لیے کسی لڑائی کی ضرورت نہیں۔ نئے حالات میں پوری طرح ممکن ہوگیا ہے کہ اسلام کا پرامن دعوہ ایمپائر بنایا جائے اور دنیا اس کے خلاف مزاحمت کرنے کے بجائے اس کے ساتھ اپنا بھرپور تعاون پیش کرے۔

دورِ مسائل کا خاتمہ

قرآن کی سورہ البقرہ کے آخر میں اُس وقت کے اہلِ ایمان کی زبان سے ایک دعا نقل ہوئی ہے۔اِس دعا کا ایک حصہ یہ ہے: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (2:286) یعنی اے ہمارے رب، ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تونے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔

اِس دعا میں 'إِصر' کا لفظ آیا ہے۔ اصر کا مطلب بوجھ (burden) ہے۔ اِس بوجھ سے مراد کوئی محدود بوجھ نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد وہ ناموافق عالمی حالات ہیں جو ہزاروں برس سے چلے آرہے تھے۔ اِسی اصر کو قرآن میں دوسرے مقام پر 'فتنہ' کہا گیا ہے اور حکم ہوا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ كُلُّهُۥ لِلَّهِ (8:39)۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں 'إِصر' سے مراد قدیم شرائع نہیں، بلکہ وہ قدیم حالات ہیں جو اہلِ توحید کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جس کلچر کا عمومی طور پر دبدبہ تھا، وہ شرک اور شخصی بادشاہت کے تحت بنا تھا۔ اِس کلچر نے مذہبی آزادی کا خاتمہ کردیا تھا۔ اسی بنا پر پچھلے زمانے میں اہلِ ایمان کو ستایا گیا۔ اِسی بنا پر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کو ستایا گیا اور ان کے خلاف جنگیں چھیڑی گئیں۔ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ خدائی دین کے خلاف اِن ناموافق اسباب کا خاتمہ ہو اور عالمی سطح پر ایسے حالات پیدا ہوں جب کہ ایک انسان پوری آزادی کے ساتھ اللہ کے دین کی پیروی کرسکے۔

اِس حقیقت کو قرآن کی ایک اور آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ ٱلَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا (28:48)۔ قرآن کی اِس طرح کی آیتوں سے مراد ایک عظیم انقلاب ہے۔ مگر اِس سے مراد کوئی سیاسی یا حکومتی انقلاب نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں سے لڑکر ''اسلامی حکومت'' قائم کرو۔ اِس سے مراد مکمل طور پر ایک غیر سیاسی انقلاب ہے، یعنی ایک ایسا انقلاب جس کے بعد تمام مواقع (opportunities) اہلِ ایمان کے لیے کھل جائے۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ ممکن ہوجائے کہ وہ

کسی رکاوٹ کے بغیر دینِ توحید کی پیروی کریں اور کسی رکاوٹ کے بغیر دعوت الی اللہ کا کام کرسکیں اِس انقلاب سے مراد بہ اعتبار مواقع (in terms of opportunities)انقلاب ہے، نہ کہ بہ اعتبارسیاسی اقتدار (in terms of political power) انقلاب۔

اسلامی حکومت کا تصور

اسلامی حکومت یا خدائی حکومت کا تصور قرآن میں سرتا سر اجنبی (alien) ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حکومت انسان کی ہوتی ہے، نہ کہ اسلام کی۔ اِس لیے قرآن میں جہاں حکومت کا ذکر ہے، وہاں اُس کو انسان سے منسوب کیا گیا ہے۔مثلاً: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ((22:41)۔اور وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55)۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، یہ اللہ کا مطلوب ہی نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ اہلِ ایمان کی حکومت قائم رہے یا لوگوں سے لڑکر حکومت پر قبضہ کیا جائے، تاکہ دنیا میں نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے۔ اِس قسم کا سیاسی نشانہ اللہ نے کبھی نہیں دیا۔ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے، وہ صرف یہ کہ عمل کے مواقع ہمیشہ کھلے رہیں۔ ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ آزادانہ طور پر دین کے انفرادی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ یہی اللہ کا اصل مطلوب ہے اور قرآن میں جو انقلاب برپا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اُس سے مراد یہی غیر سیاسی انقلاب ہے۔

اقامتِ نظام، اقامتِ مواقع

اللہ کے تخلیقی پلان کے مطابق، دنیا میں جو چیز مطلوب ہے، وہ اقامتِ نظام نہیں، بلکہ اقامتِ مواقع ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک مقرر قسم کا سوشیو پولٹکل (socio-politicial) نظام ہے اور اہلِ ایمان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اِس نظام کو اُس کے تمام اطراف وجوانب کے ساتھ زمین پر قائم کریں۔ دین کا یہ مبنی بر نظام تصور (system-based concept) سرتاسر ایک مبتدعانہ تصور ہے۔ اِس قسم کا تصورِ دین صرف کچھ لوگوں کے خود اپنے ذہن کی پیداوار ہے، خدا اور رسول کے دین سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اِس قسم کا تصورِ دین وہی چیز ہے جس کو مضاہات (9:30) کہا گیا ہے۔

اللہ کے نقشۂ تخلیق کے مطابق، اصل مطلوب چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے مواقع پوری طرح

کھلے ہوئے ہوں، ہر انسان کو مکمل آزادی ہو کہ وہ دین کے معاملے میں جس طرح چاہے اپنی قوتوں کو استعمال کرے۔ قدیم زمانے میں جارحانہ شرک، مذہبی جبر اور استبدادی حکومت (despotism) کا نظام قائم تھا۔ ہزاروں سال کی روایات کے نتیجے میں یہ ذہن لوگوں کے اوپر اِس طرح چھا گیا کہ وہ اس کے خلاف سوچ نہیں پاتے تھے۔ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کو جو انقلاب برپا کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ جدوجہد کرکے اِس دور کو ختم کرو اور وہ حالات برپا کرو جب کہ ہر ایک کو مکمل آزادی حاصل ہوجائے اور ہر ایک کے لیے تمام مواقع یکساں طور پر کھل جائیں۔

پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ذریعے ساتویں صدی میں جو انقلاب آیا، اُس کی اصل حقیقت یہی تھی۔ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، حکومت یا خلافت قائم کرنا نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ ہدایت کے تمام مواقع تمام انسانوں کے لیے کھل جائیں، دینِ خداوندی کے معاملے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اسلام کے دورِ اول میں پیش آنے والا یہی وہ انقلابی واقعہ ہے جس کا ذکر فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے اِن الفاظ میں کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ روایتی دورِ تاریخ کا خاتمہ کردیا گیا۔

اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ کو جو انقلاب مطلوب تھا، وہ ایک نسل یا دو نسل میں انجام نہیں پاسکتا تھا، اِس لیے اِس انقلاب کو تاریخ میں ایک پراسس کے روپ میں جاری کیا گیا۔ مزید یہ کہ اِس عمل میں صرف مسلمان نہیں، بلکہ سیکولر قومیں بھی شریک ہوئیں۔ اِس طرح یہ تاریخی عمل چلتا رہا۔ آخر کار انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مغرب میں اس کی تکمیل ہوئی۔ موجودہ مغربی تہذیب اِسی عمل کا نقطۂ انتہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے تاریخ میں پہلی بار ایسا کیا ہے کہ جو دنیا مسائل سے بھری ہوئی تھی، وہ ہر اعتبار سے کھلے ہوئے مواقع میں تبدیل ہوگئی۔

دین کا اصل مطلوب یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری اجتماعی نظام بنایا جائے۔ معیاری معاشرہ یا معیاری اجتماعی نظام کی جگہ جنت ہے، نہ کہ موجودہ زمین۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا میں جو چیز مطلوب ہے، وہ انفرادی سطح پر شخصیت کی تعمیر ہے، یعنی ایسے افراد کا وجود میں آنا جو اپنے اعلیٰ اوصاف کے اعتبار سے، جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔

جنت کی دنیا

جنت کیا ہے، قرآن کے مطابق، جنت وہ وسیع دنیا ہے جس کا کیمپس پوری کائنات کے برابر ہوگا۔ جنت وہ معیاری جگہ ہے جہاں تمام محدودیتیں (limitations) اور ناموافق اسباب (disadvantages) ختم ہوجائیں گے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان اِس قابل ہوگا کہ وہ زمان ومکاں سے ماورا چیزوں کا احاطہ کرسکے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان براہِ راست طور پر اللہ رب العالمین کو دیکھے گا اور اس سے کلام کرے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کی نگاہ پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرسکے گی۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں پوری تاریخ کے تمام منتخب بندے یکجا کیے جائیں گے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ اعلیٰ معیاری مناظر کا مشاہدہ کرے، وہ اعلیٰ معیاری نغموں کو سنے، وہ اعلیٰ معیاری ذائقوں کا ٹیسٹ لے سکے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کا لامحدود دماغ انفولڈ (unfold) ہوگا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں آلاء اللہ اور کلمات اللہ کو قلم بند کیا جائے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو کامل معنوں میں فل فل مینٹ لے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو اللہ کی قربت حاصل ہوگی۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں ہر قسم کی اعلیٰ سرگرمیاں موجود ہوں گی، لیکن یہ تمام سرگرمیاں معیاری معنوں میں پرمسرت سرگرمیاں (joyful activities) ہوں گی، وغیرہ۔

جنتی شخصیت

اِس طرح کی معیاری دنیا (perfect world) میں قیام کے لیے اعلیٰ ترین سطح کے تیار افراد درکار ہیں۔ صرف اعلیٰ سطح کی تیار شدہ شخصیت ہی اِس قابل ہے کہ اس کو جنت جیسی دنیا میں جگہ ملے۔ موجودہ دنیا اِسی قسم کی اعلیٰ شخصیتوں کے بننے کا مقام ہے۔ اِس قسم کی اعلیٰ شخصیت کسی کو پیدائشی طور پر نہیں ملتی۔ یہ ہر انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے آپ کو باشعور بنائے اور پھر پورے اہتمام کے ساتھ وہ اپنے اندر اِس قسم کے انسان کی تشکیل کرے۔

مذکورہ قسم کی جنتی شخصیت بلاشبہہ صرف ایک صاحبِ ایمان کے اندر بنتی ہے، مگر صاحبِ ایمان سے مراد وہ شخص ہے جس کو معرفت کے درجے میں ایمان حاصل ہو، وہ اپنے اندر اتنا زیادہ تخلیقی فکر

پیدا کرے کہ وہ خود دریافت کردہ معرفت (self-discovered realization) پر کھڑا ہو سکے۔ اس کے اندر وہ آفاقی ذہن پایا جائے جو ساری کائنات کو اپنے ربانی رزق کا دسترخوان بنا سکے، جس کی مثبت سوچ (positive thinking) اتنی بڑی ہوئی ہو کہ وہ منفی آئٹم (negative item) کو بھی مثبت آئٹم (positive item) میں تبدیل کر سکے۔ اس کا عبادتی شعور اتنا ترقی یافتہ ہو کہ وہ اِس طرح اللہ کی عبادت کرے، جیسے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔

انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** (67:2)۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو اِس لیے بسایا گیا ہے کہ یہاں احسن العمل افراد کا انتخاب کیا جا سکے۔ یہ عمل پوری انسانی تاریخ میں جاری ہے۔ خدائی نظام کے تحت اِس دنیا میں ہر فرد کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ اِس مقصد کے لیے انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے ماحول ہی میں یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون شخص احسن العمل تھا اور کون شخص احسن العمل نہ تھا۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر کا جو نظام قائم تھا، وہ اِس میں رکاوٹ تھا کہ کوئی فرد آزادانہ طور پر اپنی شخصیت کی مثبت تعمیر کرے اور اپنے آپ کو احسن العمل بنائے۔ یہ نظام، اللہ کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ اِس لیے قرآن میں اس کو فتنہ کہا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعے اِس ناموافق نظام کو توڑ دیں، تا کہ ہر انسان کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اگر چاہے تو اپنے آپ کو احسن العمل کی حیثیت سے تیار کرے۔

اسلام کا انقلابی رول

مورخ ابنِ کثیر نے اپنی مشہور کتاب البدایۃ و النہایۃ میں ابنِ اسحاق کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اِس روایت میں ایک واقعے کا ذکر ہے جو نبوت کے دسویں سال مکہ میں پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اپنی آخر عمر میں جب بیمار ہوئے اور اُن کا مرض بڑھ گیا تو قبیلہ قریش کے لوگوں نے آپس میں کہا کہ حمزہ اور عمر نے اسلام قبول کرلیا اور محمد کا امر (دین) پورے قبیلہ قریش میں پھیل گیا۔ آؤ ہم ابو طالب کے پاس چلیں۔ وہ ہم سے عہد لے لیں اپنے بھتیجے کے بارے میں اور بھتیجے سے عہد لے لیں ہمارے بارے میں۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ہم اِس سے مامون نہیں ہیں کہ وہ ہمارے امر (دین) پر غالب آجائے۔ چناں چہ قریش کے سردار ابو طالب کے پاس آئے اور اُن سے بات کی۔ یہ تھے — عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، امیہ بن خلف، ابوسفیان بن حرب، وغیرہ۔ انھوں نے کہا کہ اے ابوطالب، آپ کا ہمارے نزدیک جو درجہ ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ آپ پر جو وقت آچکا ہے، وہ آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے بارے میں ہمیں تشویش ہے۔ ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان جو معاملہ ہے، اُس سے آپ باخبر ہیں۔ آپ ان کو بلائیے۔ اُن سے ہمارے بارے میں عہد لے لیجئے اور ہم سے ان کے بارے میں عہد لے لیجئے، تاکہ وہ ہم سے باز رہیں اور ہم اُن سے باز رہیں، تاکہ وہ ہمارے دین سے تعرض نہ کریں اور ہم ان کے دین سے تعرض نہ کریں۔ پھر ابوطالب نے رسول اللہ کو بلایا اور آپ ان کے پاس آئے۔ ابوطالب نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، یہ تمھاری قوم کے بڑے لوگ ہیں۔ یہ تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں، تاکہ تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہوجائے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''یا عمِّ، کلمة واحدة تعطونها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم (البداية والنهاية 3/123) یعنی اے میرے چچا، میں اُن سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جس کو اگر وہ دے دیں تو وہ عرب کے مالک بن جائیں گے اور عجم تمھارے تابع ہوجائیں گے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ وہ کلمہ یہ ہے کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور تم چھوڑ دو اُن چیزوں کو جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو (تقولون لا إله إلا الله وتخلعون ماتعبدون من دونه) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول میں ایک تاریخی بات کو مخاطبین کی مانوس زبان میں کہا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشن کوئی محدود مشن نہیں ہے۔ یہ خالق کی ایک عظیم منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک دور کو ختم کرکے دوسرے دور کو لانے کا منصوبہ ہے۔ اگر تم اُس کا ساتھ دو تو یہ تمھارے لیے سرفرازی کا باعث ہوگا۔ اِس مشن کا ساتھ دے کر تم ایک نئے دورِ تاریخ کے نقیب (harbinger) بن سکتے ہو۔

توحید کے مشن کے ذریعے بعد کی تاریخ میں یہ انقلابی دور آیا۔ اُس نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلم علما اور مورخین نے اِس واقعے کو صرف امتِ مسلمہ کے ایک سیاسی فخر (political glory) کے طور پر لیا۔ وہ اِس انقلاب کے وسیع تر پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن سیکولر مورخین نے اِس پہلو کو دریافت کیا اور کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مورخ ہنری پرین (وفات: 1935) ہے۔ ہنری پرین نے اِس حقیقت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کا روایتی ڈھانچہ توڑ دیا گیا:

> Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اِس تاریخی واقعے کی اصل اہمیت اِس اعتبار سے نہیں تھی کہ اس کے نتیجے میں ایک مسلم ایمپائر وجود میں آئے۔ اِس واقعے کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اُس نے انسانی تاریخ کے سفر کو صحیح رخ کی طرف موڑ دیا، اس نے انسانی تاریخ کو خدائی منصوبے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو زمین پر بسایا اور اس کو ہر طرح کی آزادی دی۔ اِس تخلیق کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان موجودہ دنیا میں آئڈیل حکومت بنائے یا آئڈیل سماج قائم کرے۔ انسان کی آزادی کی بنا پر دنیا میں وہی ہونا تھا جس کو فرشتوں نے فساد (2:30) سے تعبیر کیا تھا۔ تخلیق کے اعتبار سے، فساد کا لفظ کوئی منفی لفظ نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں

مختلف قسم کے ناموافق حالات پیدا ہوں، تاکہ انسان کے لیے مسلسل طور پر چیلنج کی صورت حال باقی رہے۔ چیلنج کی یہ صورتِ حال عین مقصودِ تخلیق ہے، کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ افراد کے لیے امتحان کا ماحول جاری رہے اور مطلوب افراد کا انتخاب ممکن ہوسکے۔

قرآن کی سورہ الانعام میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: **وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى** (6:94)۔ قرآن کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اِس طرح کیا ہے — اور آئے تم ہمارے پاس ایک ایک۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کا یہ ترجمہ قرآن کی مذکورہ آیت کا نہایت صحیح ترجمہ ہے۔ ’فرادی‘ کا لفظ ’فرد‘ کی جمع ہے، یعنی افراد۔ قرآن کی یہ آیت خدا کے تخلیقی منصوبے کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زمین پر بسایا۔ اِس آبادکاری کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان دنیا میں بہتر سماجی نظام بنائے۔ بہتر سماجی نظام کی جگہ صرف جنت ہے۔

خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا اقامتِ نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ انتخابِ افراد کے لیے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آزادی کی بنا پر اِس دنیا میں کسی معیاری نظام کا بننا ممکن ہی نہیں۔ پوری تاریخ میں تقریباً تمام ذہن، مسلم اور غیر مسلم دونوں، ایک ہی مشترک غلطی میں مبتلا رہے ہیں۔ انھوں نے بہتر سماجی نظام قائم کرنے کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنایا۔ مگر بلا استثنا سب کے سب اِس مقصد میں ناکام رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اِس قسم کا نشانہ عملی طور پر ممکن ہی نہ تھا، کیوں کہ وہ منصوبۂ خداوندی کے خلاف تھا۔

خالق نے اپنے منصوبے کے مطابق، دنیا کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ ’دار الکبد‘ بنی رہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے حالات پیدا ہوں۔ لوگوں کو بار بار نقصان (2:155) کا تجربہ ہو۔ طرح طرح کے حادثات پیش آئیں۔ انسان اور شیطان کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر لوگوں کے درمیان کشمکش جاری رہے۔ یہ ناموافق حالات عین مطلوب ہیں۔ کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر انسان کے بارے میں یہ دیکھا جائے کہ مختلف حالات کے درمیان اس نے کیسا رسپانس دیا۔ اُس نے حالات کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے

استعمال کیا یا منفی ردعمل میں اپنا وقت ضائع کردیا۔

امتحانی صورتِ حال کے اِس نتیجے کا تعلق افراد سے ہے۔ ہر فرد الگ الگ حالتِ امتحان میں ہے۔ ہر فرد الگ الگ اپنا ریکارڈ تیار کررہا ہے۔ ہر فرد الگ الگ یہ بتا رہا ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب آیا اور آخر کار اس کے نتیجے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا، وہ اِسی لیے تھا کہ مذکورہ قسم کی حالت دنیا میں غیر منقطع طور پر جاری رہے۔ اسلامی انقلاب کا مقصد نہ کوئی ایمپائر قائم کرنا تھا اور نہ کوئی بہتر سیاسی یا سماجی نظام۔ اِس انقلاب کا واحد مقصد یہ تھا کہ فرد کے لیے اپنی شخصیت کی تعمیر کے مواقع لامحدود طور پر کھل جائیں۔ جو فرد یہ چاہے کہ اس کو حقیقتِ اعلیٰ کو دریافت کرنا ہے، اُس کو اپنی شخصیت کو جنتی شخصیت کے طور پر ڈیولپ کرنا ہے، اِسی کے ساتھ اُس کو دعوت الی الخیر (3:104) کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنانا ہے، جو فرد یا افراد ایسا چاہیں، اُن کے لیے ہر قسم کے مواقع پوری طرح کھلے رہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد اصلاً یہی تھا۔ اسلامی انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ زمین پر عالمی مواقع کی ایک دنیا (world of universal opportunities) وجود میں آئے۔ اِس قسم کی ایک دنیا صرف لمبے عمل کے ذریعے بن سکتی تھی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا تھا، وہ تقریباً ہزار سال تک اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔

عجیب بات ہے کہ اسلامی انقلاب کی اِس نوعیت کو نہ مسلم مفکرین نے سمجھا اور نہ غیر مسلم مفکرین نے۔ دونوں کے لیے اس کا مشترک سبب یہ تھا کہ وہ تاریخ کا مطالعہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کی روشنی میں نہ کرسکے۔ وہ خود اپنے خود ساختہ ذہن کے تحت تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے۔ اِس بنا پر دونوں گروہوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اُس خدائی حکمت (divine wisdom) سے بے خبر رہے جو انسانی تاریخ کے

درمیان مسلسل طور پر اور موثر طور پر جاری رہی۔

دورِ آزادی

اسلام کا ظہور تاریخ میں ایک انقلاب کا ظہور تھا۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں کے ذریعے تاریخ انسانی میں پہلی بار آزادی کا دور آیا۔ اِس سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں شخصی سلطنت کا مستبدانہ نظام (despotism) قائم تھا۔ اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوچکی تھیں کہ بظاہر اُن کو ختم کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ رسول اور اصحاب رسول کی قربانیوں سے تاریخ میں ایک ایسا طاقت ور پراسس جاری ہوا جس نے شخصی مطلق العنانی کے نظامِ حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ قرآن میں اِس انقلابی واقعے کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (24:55) یعنی ایسا لازماً ہونا ہے کہ دنیا سے دورِ خوف کا خاتمہ ہو اور دورِ امن ابدی طور پر دنیا میں آجائے۔

حضرت عمر فاروق نے ایک عظیم سلطنت کے حکمراں کی حیثیت سے اپنے عہد خلافت میں اِسی حقیقت کا اظہار کیا تھا، جب کہ انھوں نے ایک واقعے کے بعد مصر کے مسلم گورنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا: يا عمرو، متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلاّبي: 1/306) یعنی اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔

یہ انقلابی عمل تاریخ میں جاری رہا، یہاں تک کہ وہ سفر کرتے ہوئے یورپ تک پہنچ گیا۔ گیارہ سو سال کے بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Rousseau) نے اپنی کتاب 'سوشل کنٹریکٹ' میں لکھا کہ — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

اِسی انقلابی عمل (revolutionary process) کے بعد کے مرحلے میں 1789 میں فرانسیسی انقلاب (French Revolution) کا واقعہ ہوا۔ اِس انقلابی عمل کی تکمیل 1948 میں ہوئی جب کہ دنیا کی تمام قوموں کے اتفاق سے اقوامِ متحدہ (UNO) کی عالمی تنظیم وجود میں آئی۔

انسانی تاریخ میں آزادی کے دور کا آنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ گویا کہ تاریخ میں ایک شاہ ضرب (master stroke) کا معاملہ تھا جس کے نتیجے میں اُن تمام امکانیات کی انفولڈنگ (unfolding) شروع ہوگئی جس کو خالق نے انسان کے لیے مقدر کیا تھا۔

اِس دورِ آزادی کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسانی زندگی میں آزادی کا وہ دور شروع ہوا جب کہ کھلے ماحول میں ہر عورت اور مرد کا امتحان (test) ممکن ہو سکے۔ اِسی کے نتیجے میں دنیا کی سیاست میں سیکولرازم اور جمہوریت کا زمانہ آیا جس نے تاریخ میں پہلی بار مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ اِسی کے بعد یہ ممکن ہوا کہ انسان ہر قسم کے توہمات (superstitions) سے آزاد ہو کر فطرت کا مطالعہ کرے۔ اِسی مطالعے کا نتیجہ سائنسی علوم کا ظہور تھا جس نے پہلی بار انسان کے لیے اعلیٰ معرفت (higher realization) کا دروازہ کھول دیا۔ اِسی کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس اور جدید مواصلات کی دریافت ہوئی جس نے تاریخ میں پہلی بار عالمی دعوت کو ممکن بنا دیا، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں آزادی کو خیر اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں آزادی کے ساتھ آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اِس بنا پر آزادی کی قدر وقیمت کو صرف اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب کہ لوگوں کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کے پہلو کو الگ کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

دورِظلم، دورِدجل

دعوت الی اللہ کا کام ہمیشہ کسی نہ کسی چیلنج کے مقابلے میں انجام دیا جاتا ہے۔ داعی کے خلاف یہ چیلنج مدعو کی طرف سے پیش آتا ہے۔ مدعو اپنے زمانے کے حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ داعی، ابدی حقیقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، مدعو زمانی حالات کے زیر اثر عمل کرتا ہے۔ داعی کی طاقت اس کی نظریاتی صداقت ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس، مدعو کی طاقت وقت کا قائم شدہ نظام ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال بظاہر وقت کے ماحول میں داعی کو تنہا بنا دیتی ہے۔ اِس کے برعکس، مدعو کے بارے میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ پورا زمانہ اس کے ساتھ ہے۔

اِس اعتبار سے، دعوت کے دو بڑے دور ہیں — ایک، ماضی کا دور جب کہ داعی کو ظلم کا مقابلہ کرکے دعوت کا کام کرنا پڑا۔ اِس قدیم دور کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: **وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ** (85:8)۔

قرآن کی اِس آیت میں اُس گزرے ہوئے دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ توحید کا اعلان جان کی قربانی کی قیمت پر کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ہر جگہ جبر کا نظام (despotism) قائم تھا۔ جبر اور شرک دونوں متحد ہو کر داعی کے مخالف بن جاتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ طاقت کے زور پر وہ اس کو کچل دیں۔

چیلنج کا دوسرا دور وہ ہے جو سائنسی علوم کے ظہور سے پیدا ہوا۔ جب یہ دوسرا دور آیا تو اُسی کے ساتھ آزادی اور جمہوریت کا انقلاب آچکا تھا۔ اب داعی کے خالف جو چیلنج تھا، وہ ظلم اور جبر کا چیلنج نہیں تھا، بلکہ وہ انسان کے پیدا کردہ علوم کا چیلنج تھا۔ اب داعی کا کام یہ تھا کہ وہ علم کا جواب علم سے دے۔ وہ توحید کی صداقت کو علم کی طاقت کے ذریعے ثابت شدہ بنائے۔

اِس دوسرے دور کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: **سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53)۔ قرآن کی یہ آیت ساتویں صدی کے

ربع اول میں اتری۔ اُس وقت مستقبل کے صیغے میں بتایا گیا کہ آئندہ وہ دور آئے گا جب کہ انسانی علم کی بنا پر ایسے افکار وجود میں آئیں گے جو دین توحید کو علم کی سطح پر چیلنج کریں گے۔ اُس وقت داعی کا یہ کام ہوگا کہ وہ جوابی علم کے ذریعے اس چیلنج کا مقابلہ کرے۔ وہ آفاق وانفس کی نشانیوں، بالفاظ دیگر، دلائل فطرت کے ذریعے توحید کی صداقت کو مبرہن کرے۔ اِسی واقعے کو قرآن میں تبیین حق کہا گیا ہے۔

اِس دوسرے دور میں نظریہ توحید کو چیلنج کرنے والے جو افکار پیدا ہوں گے، وہ بظاہر علمِ انسانی کی بنیاد پر پیدا ہوں گے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ علم کی غلط تعبیر (wrong interpretation) کی بنیاد پر کھڑے ہوں گے۔ دعوتِ توحید کے خلاف یہ بظاہر ایک فکری چیلنج ہوگا، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ ایک بے بنیاد (false) چیلنج ہوگا۔ وہ ازاول تا آخر حقائق کی غلط تعبیر پر کھڑا ہوگا۔

دعوت کے خلاف یہی دوسرا چیلنج ہے جس کو حدیث میں ''دجال'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دجال مبالغے کا ایک صیغہ ہے۔ اس کا مطلب ہے: بڑا دھوکے باز (great deciever)۔ عربی زبان میں سونے کے ملمّع (golden polish) کو دجل کہا جاتا ہے۔ جیسے پیتل کے برتن کے اوپر سونے کا ملمّع کرکے اس کو غلط طور پر سونے کا برتن ظاہر کیا جائے۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ بعد کے زمانے میں دجال کا ظہور ہوگا۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، بات نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دور کی بات ہے۔ اِس پیشین گوئی سے مراد بعد کے زمانے میں آنے والا وہ دور ہے جب کہ دعوتی مشن کو ایک نئے چیلنج کا سامنا پیش آئے گا۔ اُس زمانے میں داعی کے خلاف جسمانی ظلم (physical persecution) ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کے بجائے شدید تر قسم کا فکری چیلنج (intellectual challenge) پیش آئے گا۔ یہ فکری چیلنج دجل کی زمین پر کھڑا ہوگا، یعنی علمی حقیقتوں کی باطل تعبیر کرکے اُس سے خودساختہ طور پر غلط مفہوم نکالنا اور اِس طرح انسان کو گمراہ (mislead) کرکے سچائی سے ہٹانے کی کوشش کرنا۔

فکری دجل کے اِس دور میں داعی کا کام یہ ہوگا کہ وہ علم کا مقابلہ علم کے ذریعے کرے۔

قدیم زمانے میں اگر داعی کو جہاد بالسیف کرنا پڑتا تھا تو اِس دوسرے دور میں داعی کو جہاد بالعلم کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا، یعنی وہ اہلِ باطل کے علمی مغالطوں کا بے حقیقت ہونا ثابت کرے گا۔ وہ علم کی غلط تعبیر کی جگہ علم کی صحیح تعبیر پیش کرے گا۔

اِسی دعوتی عمل کو حدیث میں، دجال کے مقابلے میں 'حجیج' کے کردار سے تعبیر کیا گیا ہے (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2937) یعنی حجت کے ذریعے دجالی فتنے کا ابطال۔ دوسرے الفاظ میں، علمی چیلنج کا جواب برتر علمی دلائل سے دینا۔

عظیم ترین شہادت

دجال کا یہ دور بیسویں صدی میں اپنی پوری صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اِس دجالی چیلنج کے مقابلے میں جو دعوتی عمل کیا جائے گا اور صداقتِ خداوندی کو جس طرح اعلیٰ علمی دلائل کے ذریعے مبرہن کیا جائے گا، وہ پوری تاریخِ دعوت کا سب سے بڑا واقعہ ہوگا۔ اِسی لیے حدیث میں اس کو هذا أعظم الناس شهادة عند ربّ العالمين (صحيح مسلم، رقم الحديث: 2938) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی خداوندِ عالم کے نزدیک، حق کی سب سے بڑی گواہی۔

حق کی سب سے بڑی گواہی کا مطلب حق کی سب سے افضل گواہی نہیں ہے۔ مذکورہ حدیثِ رسول میں یہ بات کمیاتی معنوں (quantitative terms) میں کہی گئی ہے، نہ کہ کیفیاتی معنوں (qualitative terms) میں۔ یہ بات اِس معنی میں نہیں ہے کہ اس کا درجہ اللہ کے یہاں زیادہ ہوگا، بلکہ اِس معنی میں ہے کہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے، وہ شہادت کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

اِن دو دوروں کو روایتی دور اور سائنٹفک دور میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ روایتی دور میں، دعوت کی حمایت میں فطری دلائل استعمال کیے جاتے تھے، لیکن سائنسی دور میں دعوت کے حق میں نئے دریافت شدہ علمی دلائل استعمال کیے جائیں گے۔ روایتی دور میں دعوت کی تائید کے لیے سادہ قسم کے ذرائع استعمال کیے جاتے تھے، لیکن سائنسی دور میں دعوت کی تائید کے لیے جدید قسم کے ذرائع (پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا) کا استعمال کیا جائے گا۔

روایتی دور میں ایسا تھا کہ داعی الگ ہوتا تھا اور مدعو الگ، لیکن سائنسی دور میں ایک انوکھا واقعہ یہ ہوگا کہ خود مدعو داعی کی طاقت بن جائے گا۔ مدعو کی پیدا کردہ تہذیب اور اس کے دریافت کردہ علوم داعی کے لیے پر امن ہتھیار کا کام کریں گے۔ خود مدعو کے ذریعے نئے نئے دعوتی مواقع کھل جائیں گے جن کو استعمال کر کے داعی کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ تاریخ کی عظیم ترین شہادت دے سکے — غالباً یہی وہ واقعہ ہے جس کی طرف ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ، فاجر انسان کے ذریعے بھی اِس دین کی تائید کرے گا (صحيح البخاري: رقم الحديث: 3062)

قدیم لادینیت، جدید لادینیت

قدیم زمانے کی لادینیت ظلم پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کو تاریخ مذاہب میں مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ یہ دور اُس وقت ختم ہوگیا جب دنیا سے بادشاہت (kingship) کا دور ختم ہوا اور دنیا میں مسلّمہ طور پر مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور آگیا۔ اِس دور کا آغاز اسلام کے ذریعے ہوا، مگر اس کی تکمیل نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں ہوئی۔

دورِ جدید کی لادینیت اپنے دعوے کے مطابق، علم (سائنس) پر کھڑی ہوئی ہے۔ اِس دوسرے دور کی لادینیت جہاد بالسیف کے ذریعے ختم نہیں ہوسکتی، اس کا خاتمہ صرف جہاد بالعلم کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ تاہم یہاں علم سے مراد حقیقی علم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد علم کی توجیہہ وتعبیر (interpretation) ہے۔ یہ توجیہہ تمام تر مغالطے پر قائم ہے۔ ذیل میں اس کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ برٹش سائنس داں سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) نے مادی دنیا کا مطالعہ کیا۔ اِس مطالعے میں اس نے پایا کہ مادّی دنیا کے اندر سبب اور نتیجہ (cause and effect) کا اصول پایا جاتا ہے۔ ہر مادی واقعے کے پیچھے ایک مادی سبب ہوتا ہے۔ اِس اصول کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ نیوٹن نے جو بات

کہی تھی ، اس کا تعلق مذہب یا عقیدہ سے نہیں تھا، اس نے یہ بات صرف ایک مادی ظاہرہ کی علمی توجیہہ کے طور پر کہی تھی۔

لیکن الحاد پسند مفکرین نے اس کو بطور خود مذہب کے ساتھ وابستہ کردیا اور کہا کہ یہ سائنسی دریافت خدا کے وجود کی نفی کررہی ہے۔ انھوں نے اِس سے یہ فارمولا بنایا کہ — اگر واقعات طبیعی اسباب کے تحت پیش آرہے ہیں تو وہ مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہوسکتے:

> If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یہ صرف ایک مغالطے کی بات ہے، وہ کوئی دلیل نہیں۔ نیوٹن یا دوسرے سائنس دانوں نے جو بات کہی، وہ صرف ایک طریقہ (method) کی بات تھی۔ اِس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ یہ متھڈ کس نے قائم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیعی قانون اصل واقعے کی توجیہہ نہیں کرتا، بلکہ طبیعی قانون خود توجیہہ کا طالب ہے:

> Nature does not explain, nature herself is in need of an explanation.

اصولِ تعلیل پر مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو: سر جیمز جینز کی کتاب ’پراسرار کائنات‘ (*The Mysterious Universe*)

2۔ علم کے حوالے سے ایک معروف الحادی استدلال یہ ہے کہ دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں مختلف قسم کے نقائص پائے جاتے ہیں۔ اِن حضرات کے نزدیک، یہ پرابلم آف اِول (problem of evil) ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر اِس دنیا کا خالق ایک ایسا خدا ہے جو قادرِ مطلق ہے تو دنیا میں برائی کیوں ہے۔ خدا اِس برائی کو ختم کیوں نہیں کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کے وجود کے خلاف سب سے بڑی دلیل ہے۔

مگر یہ دلیل صرف ایک غلط فکر پر مبنی ہے۔ یہ حضرات دنیا کا مطالعہ خود اپنے ذاتی ذہن کے تحت کرتے ہیں، حالاں کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ خود خالق کے تخلیقی منصوبہ (creation plan)

کی روشنی میں کیا جائے۔ خالق نے اپنے نقشے کے مطابق، اِس دنیا کو دار الامتحان (testing graound) کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اِسی مصلحت کی بنا پر خالق نے انسان کو آزادی دی ہے۔ وہ چیز جس کو 'برائی کا مسئلہ' کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِس لیے ہے کہ کچھ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔

خالق کے نقشے کے مطابق، یہ صورتِ حال قیامت تک باقی رہے گی۔ برائی سے پاک دنیا (evil-free world) موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں بنے گی، نہ کہ موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں۔ موجودہ دنیا میں برائی سے پاک فرد (evil-free individual) کا بننا تو ممکن ہے، لیکن موجودہ دنیا میں برائی سے پاک سماج (evil free society) کا قیام ممکن نہیں۔

3۔ کہا جاتا ہے کہ خالق کے وجود کے خلاف سب سے بڑی عقلی دلیل وہ نظریہ ہے جس کو نظریۂ ارتقا (theory of evolution) کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا محض ایک مفروضہ ہے، نہ کہ کوئی سائنٹفک حقیقت۔ ارتقا کے ایک عالم کے الفاظ میں — ارتقا کا نظریہ صرف ایک ورک ایبل (workable) نظریہ ہے، خالص سائنسی معیار پر وہ کوئی ثابت شدہ نظریہ نہیں۔

4۔ موجودہ زمانے کا ایک نظریہ وہ تھا جس کو ہیومن ازم (humanism) کہا جاتا ہے۔ نظریہ ہیومن ازم کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان ہی سب کچھ ہے، انسان کے اوپر کوئی اور طاقت موجود نہیں۔ ہیومن ازم کے نظریے کو اِس طرح بیان کیا جاتا ہے — سیٹ کی منتقلی خدا سے انسان کی طرف:

Transfer of seat from God to man.

ہیومن ازم کا نظریہ سراسر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے پاس کسی بھی قسم کی کوئی طاقت نہیں۔ ایسی حالت میں انسان، خدا کی جگہ کیوں کر لے سکتا ہے۔ اِس نظریہ کے ایک حامی جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ٹائٹل یہ تھا — انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے:

Man Stands Alone

جولین ہکسلے کی اِس کتاب کا نہایت مدلل جواب ایک امریکی سائنس داں نے دیا ہے۔

اِس امریکی مصنف کا نام کریسی ماریسن (Cressy Morison) ہے۔اس کی کتاب کا نام یہ ہے:

Man Does not stand Alone

جدید مادیت کی پشت پر مختلف ملحدانہ افکار کا حوالہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید مادیت کے پھیلاؤ کا اصل سبب کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں ہے۔ جدید مادیت کی توسیع زیادہ تر عملی بنیادوں (practical reasons) پر ہوئی ہے، نہ کہ نظریاتی بنیادوں (theoritical reasons) پر۔

جدید مادیت کے حامی اکثر اپنی حمایت کے لیے سائنس کا حوالہ دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید مادیت سائنس پر کھڑی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ انطباقی سائنس (applied science) پر کھڑی ہوئی ہے جس کا دوسرا نام ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔

دورِ جدید کی مسحورکن ترقیاں جس چیز کا نتیجہ ہیں، وہ یہی ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔ یہ ماڈرن ٹکنالوجی ہے جس کے نتیجے میں جدید قسم کے شہر بنے، جس کے نتیجے میں جدید قسم کے شاپنگ سنٹر وجود میں آئے، جس کے نتیجے میں جدید قسم کی سواریاں وجود میں آئیں۔ وہ قومیں جن کو ترقی یافتہ قومیں (developed nations) کہا جاتا ہے، ان کی ترقی کی بنیاد یہی ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔

موجودہ زمانے میں عمومی طور پر جو اباحیت (permissiveness) آئی ہے، وہ زیادہ تر اِسی کا نتیجہ ہے۔ لوگ جدید ٹکنالوجی سے پیدا ہونے والی ترقیوں کو دیکھ کر مسحور ہوئے اور اس میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگے۔ یہ مزاج ابتداءً صرف دنیوی ترقی کے ہم معنی تھا، لیکن دھیرے دھیرے ہر قیمت پر ترقی حاصل کرنے کا مزاج پیدا ہوا جو بڑھ کر کامل اباحیت تک پہنچ گیا۔

چار نظریاتی ستون

وہ چیز جس کو جدید فکر (modern thought) کہا جاتا ہے، اُس کے چار نظریاتی ستون ہیں۔ یہ چار نظریاتی ستون خالص علمی اعتبار سے، ابھی تک غیر ثابت شدہ ہیں، لیکن عملاً یہی چار نظریات دنیا کے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔

دنیا کی بیش تر آبادی کے لیے یہ چار نظریات گویا سیکولر عقیدہ (secular belief) کی

حیثیت رکھتے ہیں، کچھ لوگوں کے لیے شعوری طور پر اور کچھ لوگوں کے لیے غیر شعوری طور پر۔

1۔ اِن میں سے ایک نظریاتی ستون وہ ہے جس کو نظریہ ارتقا (evolution theory) کہا جاتا ہے۔ یہی مبنی بر ارتقا فکر (evolution-based thinking) ہے جس کے تحت موجودہ زمانے میں تمام حیاتیاتی مظاہر کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ یہ توجیہات اگرچہ خالص علمی اعتبار سے مفروضات کی حیثیت رکھتی ہیں، مگر عملاً عصر حاضر کے ذہن پر اِنھیں کا غلبہ ہے۔ نظریہ ارتقا کا بانی چارلس ڈارون (Charles Robert Darwin) تھا۔ ڈارون 1809 میں برطانیہ میں پیدا ہوا اور 1882 میں اس کا انتقال ہوا۔

2۔ دوسرا نظریاتی ستون وہ ہے جس کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ یہی مبنی بر اسباب فکر (causation-based thinking) ہے جس کے تحت تمام طبیعی واقعات کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ اِس نظریے کا بانی آئزک نیوٹن (Isaak Newton) تھا۔ نیوٹن 1642 میں انگلینڈ میں پیدا ہوا اور 1727 میں اس کی وفات ہوئی۔ طبیعی واقعات کی توجیہہ نیچرل اسباب (natural causes) سے کرنا سائنسی دنیا میں عام طور پر رائج ہوگیا اور عملاً وہ ابھی تک رائج ہے، اگرچہ بعد کی سائنسی تحقیقات اِس توجیہہ کو غیر علمی ثابت کرچکی ہیں۔

3۔ تیسرا نظریاتی ستون وہ ہے جس میں انسانی شخصیت کی توجیہہ خواہش کی بنیاد پر کی جاتی ہے، یعنی مبنی بر خواہش فکر (desire-based thinking)۔ اِس نظریے کے مطابق، انسان کے اندر جو خواہش ہے، وہی اس کی شخصیت کی تشکیل کرتی ہے۔ گویا انسان کو اپنی خواہش پر کنٹرول کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اتباع کرنا ہے۔ اِس نظریے کا بانی سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) تھا۔ وہ 1856 میں آسٹریا (مشرقی یورپ) میں پیدا ہوا اور 1939 میں اس کی وفات ہوئی۔

4۔ چوتھا نظریاتی ستون وہ ہے جو کارلس مارکس (Karl Henrich Marx) کے افکار (thoughts) پر مبنی ہے۔ کارل مارکس 1818 میں جرمنی میں پیدا ہوا اور 1883 میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ کارل مارکس کے پیش کردہ نظریاتی ستون کو میں اپنے الفاظ میں،

مبنی بر نظام فکر (system-based thinking) کہوں گا۔ کارل مارکس کے افکار کے تحت تاریخ میں پہلی بار وہ اجتماعی فکر پیدا ہوا جس نے سماج کی تشکیل میں نظام (system) کو بنیادی حیثیت دے دی۔ کارل مارکس کا اصل فلسفہ اگرچہ اب زیادہ تر کتب خانے کے چیز بن چکا ہے، لیکن مبنی بر نظام فکر اب بھی بہت سے لوگوں کے ذہن کا سرگرم حصہ بنا ہوا ہے۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد جو تہذیب وجود میں آئی اور جو افکار دنیا میں رائج ہوئے، ان کے یہی چار نظریاتی ستون تھے۔ اِن چار نظریاتی ستونوں کو ایک لفظ میں، زندگی اور کائنات کی مادی توجیہہ (material interpretation) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظریاتی توجیہات موجودہ زمانے میں اتنا زیادہ عام ہوئیں کہ انھوں نے قدیم الٰہیاتی توجیہہ (theological interpretation) کی جگہ لے لی۔ موجودہ زمانے میں جو دنیا پرستانہ ذہن رائج ہوا، اس کا سبب یہی جدید افکار تھے۔ اِن جدید افکار کا اثر کم وبیش تمام قوموں پر پڑا، مسلم اقوام پر بھی اور غیر مسلم اقوام پر بھی۔ مذکورہ چار نظریاتی ستون اگرچہ خالص علمی اعتبار سے، ابھی تک غیر ثابت شدہ ہیں، مگر عملی اعتبار سے ابھی تک انھیں کا رواج ساری دنیا میں قائم ہے۔

زندگی کا مقصد

11 مارچ 2006 کو شام کی فلائٹ سے میں حیدر آباد سے دہلی آرہا تھا۔ میرے ساتھ سی۔ پی۔ ایس ٹیم کے کئی اور افراد شامل تھے۔ اِس جہاز میں ایک خاتون نیہا بٹوارا (Neha Batwara) بھی سفر کررہی تھیں۔ ہماری ٹیم کے لوگ جہاز کے اندر مسافروں کے درمیان دعوہ ورک کررہے تھے۔اس سلسلے میں انھوں نے مز نیہا سے بھی بات کی اور انھیں دعوتی پمفلٹ دیے۔ یہ خاتون دہلی ائرپورٹ پر اُتر کر اپنے وطن اَلور (راجستھان) چلی گئیں۔ بعد کو حیدر آباد سے ان کا ایک خط مورخہ 28 مارچ 2006 بذریعے ای میل موصول ہوا۔ وہ خط حسب ذیل تھا:

Respected Maulana!

I am Neha, working in an MNC for some people, it cannot be better than to get a job in top MNC just after graduation. But believe me, I am in search of a more purposeful life. That's why I am writing to you.

I met Priya Malik, Khalid Ansari and Sadia Khan on a flight to Delhi and could apparently see the difference your guidance has made to their lives.

Maulana, I know we have been created by God, and we all have a purpose here to fulfill on earth, which, if done, will be more satisfying than getting heaven after death.

The point where I am lacking is to know the purpose for which I have been sent here. I could not come to your class in Delhi, because my family was against going to some spiritual classes. You understand.

I will be grateful to you for the whole of my life if you could help me in any way. I am currently in Hyderabad.
(Neha Batwara, Software Engg. MIEL, Hyderabad)

یہ خط سادہ طور پر صرف ایک خاتون کا خط نہیں ہے، بلکہ وہ ہر رُوح کی پکار ہے۔ یہ خط گویا ہر

عورت اور مرد کے دل کی ترجمانی ہے۔ ہر انسان ایک بامقصد زندگی (purposeful life) کی تلاش میں ہے۔ یہ ہر انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہ بامقصد زندگی ان کو پوری طرح موت سے پہلے کے دورِحیات میں مل جائے۔ موت کے بعد کے دورِحیات کا نہ اُن کو شعور ہے اور نہ وہ اس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اِس سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آدمی اس بامقصد زندگی کو کہاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں یا خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس کو خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں حاصل کرنا ہے۔ کیوں کہ خود اپنی بنائی ہوئی دنیا اُس کے لیے سِرے سے موجود ہی نہیں۔

ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ آدمی سب سے پہلے یہ جانے کہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے قوانین کیا ہیں اور اس کے بنانے والے نے کس تخلیقی منصوبے کے تحت اس کو بنایا ہے۔ کیوں کہ اس کی مطابقت کے بغیر وہ کسی بھی حال میں اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔

اگر آپ کے پاس ایک اچھی کار ہو اور اس کو آپ سڑک پر دَوڑانا چاہیں تو آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ جس ملک میں آپ اپنی گاڑی دوڑانا چاہتے ہیں وہاں لفٹ ہینڈڈرائیو (left-hand drive) کا اصول ہے یا رائٹ ہینڈ ڈرائیو (right-hand drive) کا۔ کامیاب سفر کے لیے اِس بات کو جاننا ضروری ہے۔ اگر آپ ایسا کریں کہ لفٹ ہینڈ ڈرائیو کے ملک میں اپنی گاڑی دائیں طرف دَوڑانے لگیں، یا رائٹ ہینڈ ڈرائیو کے ملک میں اپنی گاڑی بائیں طرف دوڑانے لگیں تو دونوں حالتوں میں آپ کامیاب سفر سے محروم رہ جائیں گے۔

یہی معاملہ زندگی کے وسیع تر سفر کا بھی ہے۔ انسان اپنی زندگی کا وسیع تر سفر کسی خلا میں یا خود اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں کرتا۔ وہ اپنا یہ سفر خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں کرتا ہے۔ اِس لیے ہر عورت اور مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کو سمجھے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو ناکامی سے نہیں بچا سکتا۔

خود انسان کا اپنا تجربہ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ہر انسان کا یہ مسئلہ ہے کہ اس کو

پیاس لگتی ہے۔ وہ اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ مگر یہ ایک معلوم بات ہے کہ ہر انسان اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ پانی کے سوا کسی اور چیز سے وہ اپنی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ اِسی طرح انسان کو بھوک لگتی ہے۔ بھوک کے معاملے میں بھی انسان یہی کرتا ہے کہ وہ فطرت کی فراہم کردہ غذا کے ذریعے اپنی بھوک مٹائے۔ ہر انسان کو سانس لینے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر انسان آکسیجن لینے کے لیے اُسی نظام کو استعمال کرتا ہے جو اس کے باہر فطرت نے قائم کیا ہے۔ یہی تمام دوسری ضرورتوں کا معاملہ ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مقصدِ حیات کا بھی ہے۔ مقصدِ حیات کے معاملے میں بھی انسان کو اپنے خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کو جاننا ہے۔ اِس معاملے میں کوئی دوسرا متبادل، انسان کے لیے نہیں۔

قرآن خالقِ فطرت کی کتاب ہے۔ قرآن میں اِس سوال کا جواب اس کی سورہ العصر میں دیا گیا ہے۔ قرآن کا یہ جواب اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ہے:

> History is a witness that man is in loss, except those who follow the course of life set by the Creator.

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خالق نے انسان کی زندگی کو دو دَوروں میں تقسیم کیا ہے قبل ازموت دَور، اور بعد ازموت دَور۔ موت سے پہلے کا دَور عمل کرنے کا دَور ہے اور موت کے بعد کا دَور عمل کا انجام پانے کا دَور۔ جو کچھ موت کے بعد ملنے والا ہے وہ موت سے پہلے نہیں مل سکتا۔ جو کچھ موت سے پہلے کرنا ہے اس کو کرنے کا موقع موت کے بعد باقی نہیں رہے گا۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان لامحدود خواہشوں (unlimited desires) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ڈیزائر ہر ایک کو بہت محبوب ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی اپنی اِن خواہشوں کی تکمیل نہ کرسکا۔ مختلف انسانوں نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ساری عمر محنت کیا۔ بظاہر انھوں نے بڑی بڑی کامیابی حاصل کی۔

مگر ہر ایک اِس حسرت کے ساتھ مرا کہ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل نہ کرسکا۔ آج کی دنیا میں وہ جس خوشی کو پانا چاہتا تھا اس کو پانے میں وہ ناکام رہا۔

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں جوڑا (pair) کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز اپنا جوڑا رکھتی ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ اصول عالمی سطح پر قائم ہے۔ زمین سے لے کر اسپیس تک ہر جگہ یہی نظام رائج ہے— نگیٹیو پارٹکل کا جوڑا پازیٹیو پارٹکل، نباتات میں میل سیکس اور فی میل سیکس، حیوانات میں مؤنث حیوان اور مذکر حیوان، انسان میں عورت اور مرد، وغیرہ۔

جوڑا یا زَوجین کا نظام تمام مخلوق میں عالمی سطح پر قائم ہے۔ اِس وسیع اور کامل نظام میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ انسانی خواہشات کا ہے۔ ہر انسان خواہشات کا گہرا احساس لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان اپنی اِن خواہشات کی تکمیل کیے بغیر مرجاتا ہے۔ دنیا میں خواہش ہے مگر اس کا جوڑا، تکمیلِ خواہش یہاں موجود نہیں۔

یہ سوال اس دنیا میں آنے والے ہر عورت اور مرد کا سوال ہے۔ ہر پیدا ہونے والا اِس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے سوال کا تشفی بخش جواب پائے وہ حسرت کے ساتھ اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

امریکی مشنری بلی گرہم (Billy Graham) نے لکھا ہے کہ ایک بار اس کے پاس امریکا کے ایک عمر رسیدہ دولت مند کا ارجنٹ مسیج آیا۔ بلی گراہم اپنے پروگرام کو ملتوی کرکے فوراً روانہ ہوگیے۔ وہ امریکی دولت مند کے گھر پہنچا تو اس کو ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات امریکی دولت مند سے ہوئی۔ امریکی دولت مند نے کسی تمہید کے بغیر کہا:

> You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope.

بلی گرہم کے پاس اِس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔ امریکی دولت مند جواب سے محرومی کا

احساس لے کر مر گیا۔ خود بلی گرہم کا یہ حال ہوا کہ تازہ اطلاع کے مطابق، وہ شدید حادثے کا شکار ہو کر معذوری کی حالت میں بستر پر پڑا ہوا ہے، اور اپنے آخری انجام کے طور پر موت کا انتظار کر رہا ہے۔

یہی معاملہ اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کا ہے۔ ہر ایک اپنی زندگی کا مقصد جاننا چاہتا ہے۔ ہر ایک، ایک پُرمسرت زندگی کی تلاش میں ہے۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو ایسی زندگی ملے جس میں اس کو پوری طرح فُل فلمینٹ (fulfillment) حاصل ہو۔ مگر ہر ایک کا انجام صرف ناکامی پر ختم ہو رہا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ہر عورت اور مرد نے یہ سمجھا کہ دنیا کے مادّی ساز وسامان ہی اصل ہیں۔ ہر ایک نے مادی ساز وسامان اکھٹا کر کے اس کے ذریعے فل فلمینٹ کی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر کسی استثنا کے بغیر ایک شخص کو بھی مطلوب فل فلمینٹ حاصل نہ ہو سکا۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اِس ناکام تجربے کو دہرایا جاتا رہے۔ اب اِس معاملے میں اصل مسئلہ نظر ثانی (reassessment) کا ہے۔ اب اصل کام یہ ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچا جائے کہ دنیا کی قابلِ حصول مادّی چیزوں میں تو ثابت شدہ طور پر فل فلمینٹ کا سامان موجود نہیں۔ ایسی حالت میں پھر یہ سامان کہاں ہے۔ جب انسانی خواہش کا تسلسل جاری ہے تو یہ ماننا ہوگا کہ وہ ایک حقیقی چیز ہے، اور جب وہ ایک حقیقی چیز ہے تو یقینا اس کی تکمیل کا سامان بھی کائنات میں ہونا چاہیے۔

اِس معاملے کو سفر کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کوئی شخص جب سفر کرتا ہے، خواہ وہ ٹرین سے سفر کرے یا ہوائی جہاز سے، اس کے سفر کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک، وہ جب کہ وہ حالتِ سفر میں ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جب کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ کامیاب سفر کے لیے ضروری ہے کہ مسافر دونوں حالتوں کے فرق کو سمجھے۔ جو مسافر اِس فرق کو نہ جانے وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو جائے گا اور غیر ضروری پریشانی میں مبتلا ہو کر اپنی عقل کھو بیٹھے گا۔

صحیح مسافر وہ ہے جو سفر کو سفر سمجھے، وہ سفر کو منزل کی حیثیت نہ دے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ سفر کے دَوران وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں جو منزل پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ہر مسافر اِس کو

گوارا کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ سفر کی حالت ایک وقتی حالت ہے۔ آخر کار اس کا سفر ختم ہوگا اور وہ اپنی مطلوب منزل پر پہنچ جائے گا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اس کو وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو وہ چاہتا تھا لیکن سفر کے دَوران وہ اُن کو حاصل نہ کر سکا۔

ہماری موجودہ زندگی بے حد مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا مختصر مدت کے لیے ہونا خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دَورانِ سفر کی حالت ہے، وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے کا لمحہ ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن نہیں کہ موجودہ مختصر زندگی میں ہم وہ تمام چیزیں پالیں جن کو ہم پانا چاہتے ہیں۔ یہ چیزیں بلاشبہہ ہم کو ملیں گی لیکن وہ منزل پر پہنچ کر ملیں گی، سفر کے درمیانی مرحلے میں وہ ہرگز ہم کو ملنے والی نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہماری زندگی دو مرحلوں میں تقسیم ہے — موت سے پہلے کا مرحلہ اور موت کے بعد کا مرحلہ۔ موت سے پہلے کا مرحلہ گویا حالتِ سفر کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلہ گویا منزل پر پہنچنے کا مرحلہ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہر انسان کی زندگی کو بامعنیٰ بناتی ہے، جو ہر عورت اور مرد کو اُس مقصد سے متعارف کرتی ہے جو اس کی زندگی کو پوری طرح بامعنیٰ بنا دے جو اس کو اطمینان کا سرمایہ عطا کرے۔

زندگی کی یہ توجیہہ اِس سوال سے جُڑی ہوئی ہے کہ موت کے بعد دوبارہ انسان زندہ ہوتا ہے۔ کیا موت کے بعد بھی اسی طرح زندگی ہے جس طرح موت سے پہلے ہم زندگی کا تجربہ کر رہے ہیں۔ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ اِس سوال کا جواب ہم عین اُسی سائنسی طریقے کے ذریعے جان سکتے ہیں جس سائنسی طریقے سے دوسری حقیقتوں کو جانا جاتا ہے۔

حقیقتوں کو جاننے کے معاملے میں سائنٹفک متھڈ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ جس بات کو جاننا ہے وہ اپنی کامل صورت میں سائنس داں کے سامنے آجائے۔ اگر یہ شرط ہو تو ساری حقیقتیں سائنسی طور پر غیر معلوم رہ جائیں۔ علم کی ترقی رُک جائے۔ حقائق کی نسبت سے انسان ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں پڑا رہے۔ کیوں کہ کوئی بھی حقیقت اِس طرح علم میں نہیں آتی کہ وہ پہاڑ کی

طرح مشہود چیز کے طور پر سامنے آجائے۔

اِس کے بجائے جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مطالعے کہ دَوران سائنس داں کے سامنے ایک سُراغ (clue) آتا ہے۔ اِس سُراغ پر غور کر کے وہ ایک ایسی حقیقت تک پہنچتا ہے جو پہلے اس کو معلوم نہ تھی۔ اِس دنیا میں ہر حقیقت سراغ کی سطح پر دریافت ہوتی ہے۔ اِس دنیا میں سراغ ہی تمام حقیقتوں کی دریافت کی کنجی ہے۔

مثلاً سائنس میں اِس کو بطور حقیقت مان لیا گیا ہے کہ تیرہ بلین سال پہلے بِگ بینگ کا واقعہ پیش آیا۔ اِسی طرح سائنس میں یہ مان لیا گیا ہے کہ زمین پر حیاتیاتی ارتقا کا واقعہ ہوا۔ اسی طرح سائنس میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کی حقیقتیں جو آج مسلّم حقیقت بن چکی ہیں وہ اِس طرح حقیقت نہیں بنیں کہ انسان نے اس کو مشاہداتی سطح پر دیکھ لیا۔ اِس کے بجائے جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک سراغ انسان کے علم میں آیا۔ پھر اِس سراغ پر غور کر کے انسانی علم ایک بڑی حقیقت تک پہنچا۔ یہ بڑی حقیقت اگر چہ دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ موجود تھی۔ اس کی موجودگی کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کر لیا گیا۔ اگر چہ اِس سلسلے میں سُراغ کے سوا کوئی اور چیز انسان کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔

یہی معاملہ موت کے بعد زندگی کا یا اگلے دَورِ حیات کا ہے۔ اگلے دَورِ حیات کے بارے میں بھی واضح سُراغ (clue) موجود ہیں۔ سراغ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو وہ ہمیں اِس یقین تک پہنچاتے ہیں کہ موت کے بعد بھی زندگی ہے۔ موت کے بعد بھی اِسی طرح ایک اور مرحلۂ حیات ہے جو لازمی طور پر ہر ایک کے سامنے پیش آئے گا۔

وہ سراغ کیا ہے۔ مثلاً انسان کا جسم بے شمار خلیوں (cells) پر مبنی ہے۔ یہ خلیّے ہر وقت ٹوٹتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا نظامِ ہضم یہ کام کرتا ہے کہ جو کچھ ہم کھاتے ہیں وہ خلیّوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہمارا نظام ہضم گویا خلیہ ساز فیکٹری ہے۔ اِس نظام کے تحت یہ ہوتا ہے کہ

عملاً تقریباً ہر دس سال میں ہمارا پورا جسم بدل جاتا ہے۔ نئے خلیوں کے ساتھ مکمل طور پر ایک نیا جسم وجود میں آجاتا ہے۔

گویا کہ ہمارے جسم پر بار بار ''موت'' طاری ہوتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا ذہنی وجود نہیں مرا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ذہنی وجود ہی انسان کا اصل وجود ہے۔ یہ ذہنی وجو بظاہر جسمانی موت کے باوجود یکساں طور پر باقی رہتا ہے۔ یہ ایک سراغ ہے جو بتاتا ہے کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ابدی مخلوق ہے۔ اس کے ابدی وجود کا تھوڑا سا حصہ قبل از موت مرحلۂ حیات میں ہے، اور اس کا بقیہ پورا حصہ بعد از موت مرحلۂ حیات میں۔

اِسی طرح اِس معاملے کا ایک سُراغ یہ ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر عدل (justice) کا تصور پایا جاتا ہے۔ انسان اپنے فطری ذہن کے تحت، یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عدل قائم ہو۔ یعنی اچھا عمل کرنے والوں کو اچھا انجام ملے اور بُرا عمل کرنے والوں کو بُرا انجام ملے۔ اِس سراغ کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو انسانی ذہن اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ موجودہ مرحلۂ حیات چوں کہ اپنی مدت کے اعتبار سے نہایت ناکافی ہے اس لیے بعد کے مرحلۂ حیات میں عدل کے تقاضے کی تکمیل ہو۔ بعد کے مرحلۂ حیات میں ہر انسان کو اس کے کیے کے مطابق، جزا یا سزا ملے۔

اِسی طرح اِس معاملے کا ایک سراغ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر معیاری دنیا (perfect world) چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا کی محدودیت (limitations) کی بنا پر یہاں مطلوب معیاری دنیا بن نہیں پاتی۔ اِس سراغ پر غور کرتے ہوئے انسانی ذہن اِس دریافت تک پہنچتا ہے کہ جو معیاری دنیا قبل از موت مرحلۂ حیات میں محدود حالات کی بنا پر حاصل نہ ہوسکی وہ بعد از موت مرحلۂ حیات میں اپنی مطلوب معیاری صورت میں حاصل ہوگی۔

اِسی طرح اِس معاملے میں ایک سراغ یہ ہے کہ انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ کسی بھی دوسرے حیوان یا غیر حیوان کے اندر کل کا تصور موجود نہیں۔ اِس سراغ کو لے کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موجودہ محدود حالات میں آدمی

اپنی جس مطلوب دنیا کو نہیں پاتا اس کو وہ موت کے بعد آنے والے لامحدود مرحلۂ حیات میں پالے گا۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں آدمی اپنے لیے پوری طرح فُل فلمینٹ کا تجربہ کر سکے گا۔

موت کے بعد معیاری دنیا بننا ویسا ہی ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جیسا کہ دوسرے ثابت شدہ واقعات۔ تاہم مستقبل کی اِس معیاری دنیا میں ہر ایک کو خود بخود جگہ نہیں مل جائے گی بلکہ صرف وہ عورت اور مرد اِس معیاری دنیا میں جگہ پائیں گے جو موت کے پہلے کی اِس دنیا میں اس کا استحقاق ثابت کرسکیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر انعام مستحقین کو ملتا ہے۔ غیر مستحقین کے لیے کبھی کوئی بڑا انعام مقدر نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے اپنے آپ کو اس معیاری دنیا کا مستحق بنانے کا فارمولا کیا ہے۔ وہ فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنے روح کی تطہیر (purification of soul)۔

جو آدمی مستقبل کی اس معیاری دنیا میں اپنے لیے جگہ حاصل کرنا چاہتا ہو اس کو آج کی اِس دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے دکھائی دینے والی دنیا (seen world) میں نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) کو اپنی بصیرت سے جانا۔ اس نے کنفیوژن کے جنگل میں سچائی کو دریافت کیا۔ اس نے منفی تجربات کے ماحول میں اپنے آپ کو مثبت رویّے پر قائم رکھا۔ اس نے اپنے آپ کو حیوانی سطح سے اوپر اٹھایا اور انسانیت کی اعلیٰ سطح پر کھڑا کیا۔ اس نے اپنے آپ کو بے اعترافی، بددیانتی، سرکشی، خودغرضی، خواہش پرستی اور انانیت جیسی پست صفات سے بچایا۔ جو پورے دل اور جان کے ساتھ جنت کا طالب بنا۔ خلاصہ یہ کہ جس نے خدا رُخی زندگی (God-oriented life) کو پوری طرح اختیار کیا۔

یہ صفات رکھنے والے عورت اور مرد خلاصۂ انسانیت ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مستقبل کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے منتخب کیے جائیں گے۔ جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کو رد کرکے کائناتی کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے حسرت کی زندگی گزاریں گے۔ وہ کبھی اِس ذلّت اور حسرت کی زندگی سے نجات نہ پاسکیں گے۔

حیوانات کے لیے زندگی صرف ایک بار ہے مگر انسان کے لیے استثنائی طور پر زندگی دو بار ہوتی ہے۔ ہر انسان اصلاً ابدی حیات کا مالک ہے۔ اِس ابدی زندگی کا بہت مختصر حصہ قبل ازموت دورِ حیات میں ہے۔ اور اس کا بقیہ تمام حصہ بعد ازموت دورِ حیات میں۔

کائنات کی دوسری چیزیں قانون فطرت کے ماتحت ہیں۔ یہاں کی ہر چیز جبری طور پر وہی کرتی ہے جو اس کے لیے قانونِ فطرت کے تحت مقدر کردیا گیا ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ انسان استثنائی طور پر ایک آزاد مخلوق ہے۔ وہ اپنا مستقبل خود اپنے آزاد ارادے کے تحت بناتا ہے۔ وہ اپنی آزادی کا یا تو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط استعمال۔ وہ اپنے مواقع کو یا تو پاتا ہے یا اس کو نادانی کے ساتھ کھو دیتا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ قرآن کی سورہ التین میں خدا نے یہ اعلان کیا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے درجے میں پھینک دیا:

We created man in the best mould, then we cast him down to the lowest of the low. (95:4-5)

یہ گویا انسان کے لیے ایک وارننگ ہے جو اس کو اس کے حال اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اعلیٰ امکانات کے ساتھ پیدا کیا، مگر انسان اپنے امکانات کا کم تر استعمال کرکے اپنے آپ کو بدترین ناکامی میں ڈال دیتا ہے:

God created man with great potential, but by under-utilizing his potential he makes himself a worst case of failure.

انسان کی شخصیت ایک دوہری شخصیت ہے — جسم اور روح (یا ذہن)۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک انسان کے جسم کا تعلق ہے،

وہ غیر ابدی ہے۔ جب کہ انسان کی روح ایک ابدی وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کی روح ایک غیر مادّی حقیقت ہے۔ وہ مادّی قوانین سے بالاتر ہے۔ جب کہ انسان کا جسم مادی قوانین کے ماتحت ہے اور مسلسل طور پر فنا پذیر ہے۔

حیاتیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم بہت چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لمحہ ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسان کا نظامِ ہضم گویا ایک خلیہ ساز فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹری مسلسل طور پر خلیّات کی سپلائی کرتی رہتی ہے۔ اِس طرح جسم اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ یہ عمل اِس طرح ہوتا ہے کہ ہر چند سال کے بعد آدمی کا جسم بالکل ایک نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا روحانی وجود کسی تبدیلی کے بغیر اسی طرح باقی رہتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ انسان کی شخصیت تغیر کے درمیان عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

انسان کی ناکامی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے غیر متغیر حصے کو نظر انداز کرتا ہے، اور اپنی شخصیت کے تغیر پذیر حصے کو اچھا بنانے میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ فانی انسان کی بہتری میں لگا دیتا ہے، اور ابدی انسان کی بہتری کے لیے وہ نہ کچھ سوچتا ہے اور نہ کچھ کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک محدود مدت گزار کر جب وہ مرتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا فانی وجود اپنی تمام ظاہری ترقیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے اور اس کا ابدی وجود ترقیات سے محروم حالت میں زندگی بعد موت کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں انسان کی ناکامی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہہ بدترین ناکامی ہے کہ انسان انتہائی اعلیٰ امکانات (potentials) کے ساتھ پیدا کیا جائے مگر وہ اپنے امکانات کو صرف ناقص طور پر استعمال کرے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اپنے اِس عدم استعمال کی قیمت دینے کے لیے اپنے ابدی دورِ حیات میں داخل ہو جائے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان استثنائی طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تصوّراتی فکر

(conceptual thought) انسان کی ایک ایسی صفت ہے جو وسیع کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں پائی جاتی۔حتی کہ حیوانات میں بھی نہیں۔اِسی لیے کہا گیا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا حیوان ہے:

Man is a thinking animal.

اِس اعتبار سے دیکھیے تو انسان کی شخصیت دو چیزوں پر مشتمل ہے— غیر تفکیری جسم، اور تفکیری روح۔ جو لوگ اپنے امکانات کو محدود طور پر صرف مادّی دائرے میں استعمال کریں وہ گویا اپنے وجود کے غیر تفکیری حصے کی تو خوب تزئین کر رہے ہیں لیکن اپنے وجود کے تفکیری حصے کی ترقی کے لیے وہ کچھ نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ موت سے پہلے کی اپنی تمام عمر جسمانی ترقی (physical development) میں صرف کر دیتے ہیں، اور جہاں تک ذہنی ترقی (intellectual development) کی بات ہے وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں پر جب موت آتی ہے تو اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اُسی طرح مرجاتے ہیں جس طرح کوئی حیوان مرتا ہے، یعنی اپنے جسم کو خوب فربہ بنانا، اور اگلے دورِ حیات میں اِس طرح داخل ہونا کہ ان کا ذہن تمام ترقیوں سے محروم ہو اور اگلے دورِ حیات میں طویل حسرت کے سوا کچھ اور ان کے حصے میں نہ آئے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور پایا جاتا ہے۔اس کائنات کی تمام چیزیں، بشمول حیوانات، صرف اپنے آج (today) میں جیتے ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو کل کا شعور رکھتا ہے، اور کل کو نشانہ بنا کر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔گویا کہ بقیہ چیزیں صرف حال (present) میں جیتی ہیں اور انسان استثنائی طور پر مستقبل (future) میں۔

قرآن کے بیان کے مطابق، وہ لوگ بدترین محرومی کا شکار ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو صرف آج کی چیزوں کے حصول میں لگا دیں اور اپنے کل کی تعمیر کے لیے وہ کچھ نہ کریں۔ایسے لوگ موت سے پہلے کی زندگی میں بظاہر خوش نما دکھائی دے سکتے ہیں لیکن موت کے بعد کی زندگی میں وہ محرومی کی

بدترین مثال بن جائیں گے۔ کیوں کہ موت کے بعد کی زندگی میں جو چیز کام آنے والی ہے وہ ذہنی اور روحانی ترقی ہے نہ کہ دنیوی مفہوم میں مادّی ترقی۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر لامحدود خواہشیں رکھتا ہے۔ اِسی کے ساتھ ہر انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کو استعمال کر کے وہ لامحدود حد تک اپنی خواہشوں کی تکمیل کرے، مگر ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا صرف اتنا استعمال کر پاتا ہے جو اس کو موت سے پہلے کی محدود دنیا میں کچھ وقتی راحت دے سکے۔ مگر آخر کار ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِن تمام صلاحیتوں کو لیے ہوئے موت کے بعد والی ابدی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر بے راحت زندگی گزارے، کیوں کہ اُس نے اِس دوسرے دورِ حیات کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کیا تھا۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے حقیقت پسندانہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اِس طرح کرے کہ اس کی فطری صلاحیتیں بھرپور طور پر اس کے ابدی مستقبل کی تعمیر میں استعمال ہوں۔ وہ اپنے امکانات (potentials) کو سمجھے اور اُن کو اِس طرح استعمال کرے کہ وہ اپنے ابدی دورِ حیات میں ان کا مفید نتیجہ پا سکے۔ وہ اپنے آپ کو اِس بُرے انجام سے بچائے کہ آخر میں اس کے پاس صرف یہ کہنے کے لیے باقی رہے کہ میں اپنے امکانات کو استعمال کرنے سے محروم رہا:

I was a case of missed opportunities.

انسان کے لیے حقیقت پر مبنی منصوبہ بندی یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں مادی چیزوں کے معاملے میں صرف ضرورت (need) پر قناعت کرے، اور اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کا بیش تر حصہ اِس پر خرچ کرے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی میں ایک مُطہَّر شخصیت (purified personality) کے ساتھ داخل ہو۔ تا کہ اس کو ابدی دورِ حیات کی معیاری دنیا (perfect world) میں عزت اور راحت کی مطلوب زندگی مل سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ موت سے پہلے کے دورِ حیات اور موت کے بعد کے دورِ حیات دونوں میں

کامیابی کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنے آپ کو تیّار شخصیت (prepared personality) بنانا۔ مادّی معنوں میں تیار شخصیت موت سے پہلے کے دورِ حیات میں ترقی کا ذریعہ بنتی ہے، اور روحانی معنوں میں تیار شخصیت اُس دورِ حیات میں کام آئے گی جہاں موت کے بعد آدمی کو رہنا ہے۔

مادی معنوں میں تیار شخصیت یہ ہے کہ آدمی پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرے۔ آدمی کے اندر تجارتی صلاحیت ہو۔ آدمی کے اندر وہ صفات ہوں جن کے ذریعے کوئی شخص لوگوں کے درمیان مقبول ہوتا ہے۔ آدمی قریبی مفاد (immediate gain) کو آخری حد تک اہمیت دیتا ہو، وغیرہ۔

موت کے بعد کے دورِ حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو تیار شخصیت درکار ہے وہ ایسی شخصیت ہے جس نے موجودہ دنیا کے مواقع کو روحانی ارتقا (spiritual development) اور فکری ارتقا (intellectual development) کے لیے استعمال کیا۔ ایسی ہی شخصیت موت کے بعد کے دورِ حیات میں با قیمت ٹھہرے گی۔

یہ شخصیت وہ ہے جس نے اپنی عقل کو استعمال کر کے سچائی کو دریافت کیا۔ جو شبہات کے جنگل میں یقین پر کھڑا ہوا۔ جس نے خدا کو اپنی زندگی کا واحد کنسرن بنایا۔ جس نے خود پسندی کے جذبات کو کچل کر خدا پرستی کے طریقے کو اختیار کیا۔ جو منفی حالات میں مثبت سوچ پر قائم رہا۔ جس نے نفسانی انسان بننے کے بجائے ربّانی انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ جس نے مفاد پرستی کے بجائے اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ جس نے اپنے آپ کو نفرت سے بچایا اور اپنے اندر انسانی خیر خواہی کے جذبات کی پرورش کی۔ جس نے آزادی کے باوجود اطاعت (submission) کا طریقہ اختیار کیا۔

دیوارِ قہقہہ
The Story of the Wall of Laughter

ایک پُرانا قصہ ہے کہ کسی مقام پر ایک مضبوط دیوار تھی۔ یہ دیوار بہت اونچی تھی۔ اِسی کے ساتھ وہ دونوں طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اُدھر رہتے ہیں۔ دیوار کے اِس طرف جو لوگ

رہتے تھے، انھوں نے یہ چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اِس مقصد کے لیے انھوں نے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی، پھر انھوں نے اُس سیڑھی کو دیوار کے ایک طرف کھڑا کیا اور اپنے ایک آدمی کو سیڑھی پر چڑھایا، تاکہ وہ دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں سے دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ اِس مشاہدے کے بعد وہ نیچے آکر دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو دیوار کے دوسری طرف کا حال بتائے۔ لیکن جب یہ آدمی لمبی سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر پہنچا تو دوسری طرف کی دنیا اُس کو اتنی زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔

اِس کے بعد دیوار کے اِس طرف رہنے والوں نے اپنے ایک اور آدمی کو تیار کیا اور اس کو لمبی سیڑھی کے اوپر چڑھایا، لیکن دوبارہ یہی ہوا کہ جب وہ آدمی دیوار کے اوپر پہنچا تو قہقہہ لگا کر وہ دوسری طرف کود پڑا۔ یہ تجربہ بار بار کیا جاتا رہا، لیکن ہر بار یہی ہوا کہ اوپر چڑھنے والے آدمی کو دوسری طرف کا منظر اتنا پُرکشش نظر آیا کہ وہ قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔ اِس طرح دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کے لیے دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور نامعلوم بنا رہا۔

اِس افسانوی دیوار کو اگر موت کی دیوار مانا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ دیوار کے اِس طرف ہے، اور اس کا دوسرا حصہ دیوار کے دوسری طرف۔ دیوار کے دوسری طرف خوشیوں کی دنیا، یا دوسرے لفظوں میں، جنت کی دنیا بسی ہوئی ہے اور دیوار کے اِس طرف محنت اور مشقت کی دنیا ہے، تو یہ کہانی انسانی تاریخ کے اوپر مکمل طور پر صادق آئے گی۔ یہ تمثیلی کہانی گویا کہ پوری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔

انسان پیدائشی طور پر اپنے لیے خوشیوں کی ایک زندگی چاہتا ہے۔ اِس اعتبار سے انسان کو متلاشیٔ مسرت حیوان (joy-seeking animal) کہا جاسکتا ہے۔ قدیم انسان نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی زندگی مختلف قسم کے غم سے بھری ہوئی ہے، تو اس نے اپنے لیے ایک پُرمسرت زندگی کی تلاش شروع کردی۔ اِس تلاش کا غالباً پہلا نمایاں واقعہ پہیہ (wheel) کی دریافت تھی۔ پہیے کی

دریافت کے بعد تلاشِ مسرت کا یہ انسانی سفر شروع ہوگیا۔ اِس سفر کو ایک متعین نام دینا ہو تو اُس کو تہذیب (civilization) کا سفر کہا جاسکتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر چلتا رہا۔ لمبی مدت کے بعد آخرکار یہ سفر جدید تہذیب (modern civilization) کے دَور تک پہنچ گیا۔ اب اُس کو تیز رفتار سفر کے لیے مشین کی طاقت حاصل ہوگئی۔ جدید کمیونی کیشن کا زمانہ آیا اور جسمانی سفر کے بغیر انسان کی آواز اور اس کی متحرک تصویر بعید ترین مسافت تک پہنچنے لگی۔ جدید انڈسٹری نے کنزیومرازم (consumerism) کا دور پیدا کیا، جب کہ راحت اور آسائش کی تمام چیزیں غلّے اور سبزی کی طرح بازار میں بکنے لگیں، وغیرہ۔

اِس طرح انسانی تہذیب کامیابی کے ساتھ لمبا سفر طے کرتے ہوئے آخر کار اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ گئی، لیکن اِس آخری منزل پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک نیا شدید تر مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب یہ ہوا کہ دیوارِ قہقہہ (laughter wall) اُن کے لیے ایک نئی قسم کی دیوارِ گریہ (wailing wall) بن گئی۔ اب معلوم ہوا کہ انسان نے لمبی جدوجہد کے بعد جو دنیا اپنے لیے بنائی تھی، وہ انسان کے لیے خوشیوں کی دنیا نہ تھی، بلکہ وہ صرف نئی ناقابلِ عبور مصیبتوں کی ایک دنیا تھی۔ چناں چہ اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب ایک بند گلی (blind alley) تک پہنچ کر انسانی تاریخ کے خاتمہ (end of history) کے ہم معنیٰ بن گئی۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک ہے، وہ یہ کہ خوشیوں کی ایک دنیا بنانے کے لیے ایک مکمل انڈسٹری درکار ہے۔ انسان نے لمبی جدوجہد کے بعد ایک ایسی انڈسٹری تیار کی، لیکن جب یہ انڈسٹری تیار ہوگئی تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ انڈسٹری ایک نیا ناقابلِ عبور مسئلہ لے کر آئی ہے۔ یہ مسئلہ فضائی کثافت (air pollution) کا مسئلہ ہے، جو کہ انسانی انڈسٹری کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے۔ ہم کو اپنی مطلوب راحتوں کی دنیا بنانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution-free industry) درکار ہے، اور بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اِس طرح کثافت کے مسئلے نے

عملی طور پر تہذیب کے تمام ثمرات (achievements) کی نفی کردی ہے۔

ایک طرف، اپنی مطلوب دنیا بنانے کے لیے انسان کے عجز کا یہ معاملہ ہے اور دوسری طرف، اِسی دنیا میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ایک بے کثافت انڈسٹری عملاً ہزاروں سال سے مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ فطرت (nature) کی انڈسٹری ہے۔ تہذیب، بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانے میں مکمل طور پر ناکام رہی، لیکن اِسی دنیا میں فطرت (nature) ایک مکمل قسم کی بے کثافت انڈسٹری بہت بڑے پیمانے پر بالفعل (in action) قائم کیے ہوئے ہے۔

موجودہ سیارۂ زمین جس پر انسان رہتا ہے، وہ مسلسل طور پر گردش میں ہے۔ وہ اپنے محور (axis) پر ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔ اِسی کے ساتھ وسیع خلا میں سورج کے گرد وہ اپنے مدار (orbit) پر 19 کروڑ میل کا لمبا سفر طے کرتا ہے، پہلا سفر 24 گھنٹے میں پورا ہوتا ہے اور دوسرا سفر ایک سال میں۔ سیارۂ زمین کا یہ دوطرفہ تیز رفتار سفر مسلسل طور پر جاری ہے، لیکن یہاں نہ کوئی شور (noise) ہے اور نہ کسی قسم کی کثافت (pollution)۔

سورج آگ اور انرجی کا بہت بڑا بھنڈار ہے۔ وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اُس سے 12 لاکھ زمینیں بن سکتی ہیں۔ وہ زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل دور رہتے ہوئے مسلسل طور پر ہم کو روشنی اور حرارت بھیج رہا ہے، لیکن دوبارہ یہاں کسی قسم کی کوئی کثافت (pollution) مطلق موجود نہیں۔ اِسی طرح نیچر میں ایک اور انڈسٹری ہے۔ یہ درختوں اور پودوں کی صورت میں قائم ہے۔ یہ انڈسٹری ایک نہایت پیچیدہ نظام کے تحت، انسان کو مسلسل طور پر صحت بخش آکسیجن سپلائی کر رہی ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ ہماری سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم انڈسٹری ہے، لیکن یہ انڈسٹری بھی شور اور کثافت جیسی نامطلوب چیزوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔

اِسی طرح پانی کو دیکھیے۔ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ بڑے بڑے سمندروں کی صورت میں ہماری زمین پر موجود ہے۔ اِس ذخیرے میں تحفظّاتی مادّہ (preservative) کے طور پر تقریباً 10 فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ اِس بنا پر وہ براہِ راست طور پر انسان کے لیے قابلِ استعمال نہیں۔

یہاں بارش کی صورت میں ایک عظیم آفاقی عمل جاری ہے، جس کو ازالۂ نمک (desalination) کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ناقابلِ بیان حد تک ایک عظیم انڈسٹری ہے، لیکن یہ انڈسٹری کسی قسم کی کوئی کثافت پیدا نہیں کرتی۔

یہی معاملہ انسانی خوراک کا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوراک غلّہ اور سبزی اور پھل اور دودھ اور مچھلی اور گوشت، وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام خوراک بھی مسلسل طور پر انسان کے لیے وجود میں لائی جا رہی ہے۔ یہ عمل بھی ایک عظیم انڈسٹری کے ذریعے انجام پاتا ہے، لیکن یہاں بھی انسانی صنعتوں کی مانند کوئی کثافت پیدا نہیں ہوتی۔

یہ دو مختلف قسم کے تجربے ہیں۔ ایک، انسانی تہذیب کی انڈسٹری اور دوسرے، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری۔ انسانی تہذیب کی انڈسٹری ہمارے لیے خوشیوں اور راحتوں کی دنیا بنانے میں ناکام ہے۔ وہ راحت کے سامان وجود میں لانے کی کوشش میں مصیبتوں کا ایک نیا جنگل اُگا دیتی ہے۔ دوسری طرف، عین اُسی وقت، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری راحت کے تمام سامان پیدا کر رہی ہے، لیکن وہ مکمل طور پر ایک بے کثافت انڈسٹری ہے، نہ کہ انسانی انڈسٹری کی طرح پُر کثافت انڈسٹری۔

اب اگر قدیم کہانی کے مطابق، دیوار کو موت کی دیوار قرار دیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دیوار کے ایک طرف دنیائے گریہ (wailing world) ہے، اور اِس دیوار کے دوسری طرف دنیائے قہقہہ (laughter world) ہے۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر تہذیبِ انسانی کی ناکامی ہمیں ایک نیا پُر امید سبق دے رہی ہے، وہ یہ کہ ہم ''دیوار'' کے اِس طرف ناکام طور پر اپنی دنیائے قہقہہ بنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ''دیوار'' کے دوسری طرف کی ''دنیائے قہقہہ'' میں اپنی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں، جو کہ بَروقت ہی ڈوائن نظام کے تحت ''دیوار'' کے دوسری طرف موجود ہے۔

جنت اور انسان

غالباً 1998 کی بات ہے، ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے مجھے دہلی کے ایک سینئر اسکالر سے ملایا۔ یہ پروفیسر نونہال سنگھ (پیدائش: 1923) تھے۔ امریکا سے رٹائر ہو کر آنے کے بعد یہاں ان کو

راجیہ سبھا کا ممبر (1992-1998) بنا دیا گیا تھا۔ اُن کا گھر ایک کتب خانہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس میں ہر طرف لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک اسکالر دکھائی دیتے تھے۔

ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ پولٹکل سائنس میں انھوں نے ایم اے کیا تھا۔ اِس کے بعد انھوں نے انٹرنیشنل ریلیشنس (international relations) کے سبجیکٹ پر ڈاکٹریٹ کیا۔ اُس زمانے میں امریکا کی ایک یونی ورسٹی کو اپنے لیے اِس موضوع پر ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ اُس کا اشتہار دیکھ کر پروفیسر سنگھ نے اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ جلد ہی انھیں یونی ورسٹی کی طرف سے ایک لیٹر ملا، اِس میں انھیں انٹرویو کے لیے امریکا بلایا گیا تھا۔

وہ امریکا پہنچے تو ائر پورٹ پر ایک صاحب اُن سے ملے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یونی ورسٹی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، تاکہ یہاں میں آپ کو گائڈ کروں۔ اِس کے بعد اُس آدمی نے پروفیسر سنگھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور اُن کو لے کر یونی ورسٹی پہنچا۔ یونی ورسٹی میں پروفیسر سنگھ کو وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا۔

اِس کے بعد وہ آدمی روزانہ پروفیسر سنگھ کے پاس آتا اور ان کو لے کر صبح سے شام تک یونی ورسٹی کے وسیع کیمپس میں گھماتا رہتا۔ اِس طرح وہ آدمی پروفیسر سنگھ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا اور یونی ورسٹی کی ہر سرگرمی میں انھیں شامل کیا۔ مثلاً لائبریری، ڈائننگ ہال، کلاس روم، ٹیچرس کلب، اسٹوڈنٹس میٹنگ، یونی ورسٹی ورکرس، وغیرہ۔

اِس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ پروفیسر سنگھ کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین سے کہا کہ میں ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اب تک میرا انٹرویو نہیں ہوا۔ چیئرمین نے کہا کہ آپ کا انٹرویو ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کا سلیکشن کرلیا ہے، اور اب آپ کل سے ہمارے یہاں جوائن کر لیجیے۔ اِس کے بعد چیئرمین نے بتایا کہ ائر پورٹ پر ہمارا جو آدمی آپ سے ملا تھا، وہ یہاں کا سینئر پروفیسر تھا۔ اور وہی آپ کا انٹرویور بھی تھا۔

چیئرمین نے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات کو دیکھنے کے بعد ہم نے جان لیا تھا کہ

جہاں تک تعلیمی لیاقت کا تعلق ہے، آپ اس کے پوری طرح اہل ہیں۔ اب ہم کو یہ جاننا تھا کہ آپ ہمارے یونی ورسٹی کلچر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا مذکورہ انٹرویور یہی کام کر رہا تھا۔ وہ آپ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا۔ اس نے یہاں کی تمام ایکٹوٹیز (activities) سے آپ کو متعارف کرایا۔ اس نے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرس دونوں کے ساتھ آپ کے سلوک کو دیکھا۔ اِس دوران وہ آپ کی ہر بات کا دقّتِ نظر کے ساتھ معائنہ کرتا رہا۔ انٹرویور کی رپورٹ آپ کے بارے میں پوری طرح مثبت ہے۔ چناں چہ آپ کے ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد ہم نے آپ کا انتخاب کرلیا ہے۔ آپ کل سے یہاں اپنا کام شروع کر دیں۔

یہ واقعہ ایک حقیقی مثال کی صورت میں، جنت اور انسان کے معاملے کو بتاتا ہے۔ خدا نے ایک وسیع دنیا بنائی، جنت کی دنیا۔ یہ دنیا پورے معنوں میں ایک کامل دنیا تھی۔ یہاں ہر چیز اعلیٰ معیار کے مطابق تھی۔ خدا نے چاہا کہ اِس کامل دنیا میں وہ ایسے لوگوں کو بسائے جو اپنے کردار کے اعتبار سے اُس کے لیے پوری طرح اہل ہوں، جو اِس معیاری دنیا میں معیاری انسان کی حیثیت سے رہ سکیں۔

اب خدا نے اِس دنیا کے تعارفی نمونے کے طور پر موجودہ زمینی سیّارہ بنایا۔ یہاں وہ ساری چیزیں پائی جاتی ہیں جو جنتی دنیا کے اندر موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنتی دنیا، معیاری دنیا (perfect world) ہے اور موجودہ زمینی دنیا، غیر معیاری دنیا (imperfect world)۔ جنتی دنیا کامل ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر کامل۔ جنتی دنیا ابدی ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر ابدی۔ جنتی دنیا ہر قسم کے خوف اور حُزن سے خالی ہے، جب کہ موجودہ دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ خوف اور حزن سے بھری ہوئی ہے۔ جنتی دنیا انعام (reward) کی دنیا ہے اور موجودہ دنیا آزمائش (test) کی دنیا۔

اِس منصوبے کے تحت، خدا نے انسان کو پیدا کر کے اس کو موجودہ زمینی دنیا میں بسایا۔ خدا نے انسان کو کامل آزادی دے دی۔ اُس نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ یہاں کسی پابندی کے بغیر رہے۔ اُس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی آزادی کو چاہے تو غلط طور پر استعمال کرے اور چاہے تو درست طور پر

استعمال کرے۔ ہر انسان جو زمین پر پیدا ہوتا ہے، اُس کے ساتھ خدا کے دو غیر مَرئی (invisible) فرشتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ وہ انسان کے ہر قول اور عمل کا مکمل ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر اس کے لیے اگلی دنیا میں جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔

جنتی دنیا میں انسان کامل آزادی کے ساتھ رہے گا، لیکن وہ اتنا زیادہ پختہ اور اتنا زیادہ باشعور ہوگا کہ وہ کسی بھی حال میں اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرے گا۔ وہ پوری طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی پوری طرح ڈسپلن میں رہے گا۔ یہی وہ انسان ہے جس کے سلیکشن کے لیے موجودہ زمینی سیّارہ بنایا گیا۔ موجودہ دنیا میں بھی وہ سارے حالات پائے جاتے ہیں جو جنتی دنیا میں موجود ہوں گے۔ اب یہ دیکھا جا رہا ہے کہ وہ کون انسان ہے جس نے ہر قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جنتی کیریکٹر کا ثبوت دیا۔ اُسی انسان کا انتخاب کرکے اس کو جنتی دنیا میں ابدی طور پر بسا دیا جائے گا۔

ہر انسان کے ساتھ خدا کے غیر مرئی فرشتے لگے ہوئے ہیں اور وہ ہر لمحہ اس کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ یہی انسان کا ٹسٹ ہے، اور اِسی ٹسٹ کے نتیجے کی بنیاد پر ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی ہر موقع پر خدا کی بڑائی کا اعتراف کرے، یعنی آدمی کے ضمیر نے جب اس کو ٹوکا تو اس نے ضمیر کی آواز کو مانا، یا اس کو نظر انداز کر دیا۔ جب اس کے سامنے دلیل کے ساتھ ایک سچائی آئی تو وہ اس کے آگے جھک گیا، یا اس نے اس کے خلاف سرکشی دکھائی۔ جب اپنی انا اور سچائی کا مقابلہ ہوا تو وہ اپنی انا کے پیچھے چلا، یا اُس نے سچائی کا اعتراف کیا۔

اِسی طرح لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ انصاف پر قائم رہا، یا اپنے انٹرسٹ کی خاطر بے انصافی کرنے لگا۔ وہ صرف لوگوں کے سامنے اچھا بنا رہا، یا اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی وہ اچھائی پر قائم رہا۔ اس نے حق کو اپنا سپریم کنسرن بنایا، یا حق کے سوا کسی اور چیز کو وہ اپنا کنسرن بنائے رہا۔ اسی طرح یہ کہ جب اس کو اقتدار ملا تو وہ بگاڑ کا شکار ہوگیا، یا اقتدار کے باوجود اس نے اپنے آپ کو انصاف پر قائم رکھا۔ جب اس کو دولت حاصل ہوئی یا اس کو غریبی کا تجربہ ہوا تو دونوں حالتوں میں یکساں طور پر اس نے اعتدال کا ثبوت دیا، یا وہ اعتدال کے راستے سے ہٹ گیا۔ سماجی زندگی میں جب اس کو آگے کی

سیٹ ملی، اس وقت وہ کیسا تھا اور جب اس کو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنا پڑا تب اس کا رویہ کیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کو اصول کا پابند رکھا، یا اصول سے ہٹ کر وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے لگا۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

موجودہ زمینی دنیا ایک محدود مدت کے لیے بنائی گئی ہے۔ اِس مدت کے پورا ہونے کے بعد یہاں پیدا ہونے والے تمام انسان، خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔ خدا، فرشتوں کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ کے مطابق، ہر ایک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ جس عورت یا مرد کا ریکارڈ بتائے گا کہ وہ زمینی دنیا میں جنتی کردار کے ساتھ رہا، اُس نے اپنی آزادی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے دائرے کے اندر استعمال کیا اور اِس طرح یہ ثابت کیا کہ وہ جنتی دنیا کے ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہے، ایسے لوگوں کو جنت کے باغوں میں رہنے کے لیے منتخب کرلیا جائے گا۔ اور وہ تمام لوگ جو جنتی کردار کا ثبوت نہ دے سکے، اُن کو رد کر کے کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے مایوسی اور حسرت کی زندگی گزارتے رہیں اور کبھی اُس سے چھٹکارا نہ پاسکیں۔

ذہنی سکون کا راز

چارلس ڈیوک (Charles Mass Duke Jr.) ایک امریکی خلاباز (astronaut) ہیں۔ وہ 1935 میں امریکا (North Carolina) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسپیس سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ 1966 میں ناسا (NASA) کے پانچویں خلاباز گروپ کے لیے منتخب کیے گئے۔ انھوں نے خلا (space) میں کئی پروازیں کیں۔ 1972 میں انھوں نے اپالو (Apollo-16) کے ذریعے چاند کا سفر کیا۔ 16 اپریل 1972 میں وہ چاند کی سطح پر اُترے۔

21 فروری 2008 کی شام کو ہماری ٹیم کے دو ممبر (رجت ملہوترا، سعدیہ خان) ڈاکٹر چارلس ڈیوک سے نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل میں انٹرویو کے لیے ملے۔ ملاقات کے وقت انھوں نے اپنے دست خط کے ساتھ اپنی ایک تصویر دی۔ اِس تصویر میں وہ خلائی سوٹ میں چاند کی سطح پر کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تصویر اِس مضمون کے ایک الگ صفحے پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ہماری ٹیم کے مذکورہ دونوں ممبروں نے امریکی خلاباز ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو کا موضوع اسپریچولٹی (spirituality) تھا۔ انٹرویو کے دوران اُن سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں، اور آپ کو پُرمسرت زندگی حاصل ہے۔

اِس کے جواب میں امریکی خلاباز ڈاکٹر چارلس ڈیوک نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ — ابتدائی طور پر میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ چاند مجھ کو سکون دے گا۔ میں نے یہ سمجھا کہ خلابازی کی زندگی مجھے سکون عطا کرے گی۔ میں خلاباز (astronaut) بن گیا، مگر خلابازی کی زندگی نے مجھ کو سکون نہیں دیا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اپنا کیریر بدل دوں۔ میں نے ناسا (NASA) میں ایسٹروناٹ کا جاب چھوڑ دیا اور بزنس شروع کردیا۔ میں نے کافی دولت کمائی، مگر اب بھی میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب بھی

میری زندگی میں کوئی چیز مفقود ہے:

> I had no peace in life. I thought the moon would give me peace. I thought all these goals, all these accomplishments, this great career would give me peace, but it didn't, So I thought I'll change career. So I left NASA as an astronaut and went into business. Imade a lot of money but I still had no peace in my life. There was still something missing.
>
> (Charlse Duke Jr., New Delhi, February 21, 2008)

یہ معاملہ صرف ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا نہیں، یہی موجودہ زمانے میں تمام لوگوں کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانے میں دولت اور شہرت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔لوگ نہایت تیزی کے ساتھ اِن چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اِن چیزوں کو پانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ایسے لوگوں کو سپر اچیورس (super achievers) کہا جاتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ تمام سپر اچیور کا کیس سپر ناکامی (super failure) کا کیس تھا۔سب کچھ پانے کے باوجود اِن لوگوں کو داخلی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔آخر کار وہ مایوسی کا احساس لے کر مر گئے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ اِس صورتِ حال نے موجودہ زمانے میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والے (super achievers) کہا جاتا ہے۔مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ہر بڑی کامیابی آخر میں صرف بڑی ناکامی (super failure) بن گئی۔ اِس قسم کے لوگ نئے قسم کے سنگین مسائل میں مبتلا ہو گئے۔مثلاً مہلک بیماریاں، وغیرہ۔

اِنھیں نئے مسائل میں سے ایک ٹنشن (tension) یا اسٹریس (stress) ہے۔لوگوں کے پاس دولت اور شہرت اور اقتدار سب کچھ موجود ہے، لیکن اِن ظاہری کامیابیوں کے باوجود لوگ مسلسل طور پر ٹنشن اور اسٹریس میں مبتلا رہتے ہیں۔زیادہ دولت صرف زیادہ بیماری کا سبب بن رہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ رسرچ میڈیکل سائنس میں ہورہی ہے، تاکہ نئی نئی بیماریوں کا علاج دریافت کیا جاسکے۔

اِس صورتِ حال کے نتیجے میں ایک نیا بزنس شروع ہوگیا ہے جس کو ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کہا جاتا ہے۔ اِن اداروں میں بڑے بڑے ماہرین، لوگوں کو اسٹریس سے نجات دینے کے لیے سرگرم ہیں۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ لوگوں کا ٹنشن اور اسٹریس بدستور بڑھتا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا خطرہ تیسری عالمی جنگ کا خطرہ نہیں ہے، بلکہ ٹنشن اور اسٹریس کا خطرہ ہے۔

یہ صورتِ حال ہم کو قرآن کی ایک آیت کی یاد دلاتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (13:28) ۔ اِسی بات کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں فرمایا: اللہم لاعیش إلاّعیش الآخرۃ (صحیح البخاری، کتاب الرّقاق)۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے برتر ہی کو اپنا سپریم کنسرن (supreme concern) بنانے سے انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اپنی پسند کی جو زندگی انسان چاہتا ہے، وہ صرف موت کے بعد کے دورِ حیات میں کسی انسان کو ملے گی۔ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں کسی کو اپنی پسند کی زندگی ملنے والی نہیں۔

اِس معاملے کا براہِ راست تعلق خالق کے کریشن پلان (creation plan of God) سے ہے۔ خالق نے موجودہ دنیا کو امتحان گاہ (testing ground) کے طور پر بنایا ہے۔ موجودہ دنیا کسی کے لیے بھی اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی جگہ نہیں بن سکتی۔ موجودہ دنیا ہر عورت اور مرد کے لیے سفر کا مرحلہ ہے، اور بعد کو آنے والی آخرت کی دنیا اس کی ابدی منزل ہے۔

آپ، بس یا ٹرین یا ہوائی جہاز میں سفر کررہے ہوں اور اس کے اندر آپ گھر والی سہولتیں حاصل کرنا چاہیں، تو آپ اس کو حاصل نہ کرسکیں گے۔ کیوں کہ سواری صرف سواری ہے، وہ گھر کا بدل نہیں۔ اِس طرح موجود دنیا میں خواہشوں کی تکمیل (fulfillment) کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ جو آدمی اپنی خواہشوں کی تکمیل چاہتا ہو، اس کو آخرت کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (37:61)۔

تخلیق کس لیے

Creation For What

3 جنوری 2006 کی رات کو میں دہلی میں اپنی رہائش گاہ (سی۔ 29، نظام الدین ویسٹ) میں تھا۔ رات کو پچھلے پہر میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ امریکا کے صدر جارج بش جو نیئر، میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے بیٹے کو پڑھا دیجئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ایک بڑے مکان میں ہوں۔ میں اس مکان کے اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں جاتا ہوں۔ وہاں جارج بش کے بیٹے مغربی لباس پہنے ہوئے میرے پاس آتے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً بارہ سال ہے۔ بیٹے نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا:

Why was man created

نیند کھلی تو میں نے اس خواب پر غور کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آج کی پوری دنیا کا سوال ہو۔ آج پوری انسانیت شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سوال سے دوچار ہے۔ آج ہر انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے آنے 0 کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا۔ کائنات کے وسیع نقشے میں اس کا مقام کیا ہے۔ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر وہ اپنی اس مطلوب منزل تک پہنچ سکتا ہے، جو اس کے دماغ میں بسی ہوئی ہے۔

وہ دنیا جس کو جدید دنیا کہا جاتا ہے، وہ پوری بشری تاریخ کا ایک انوکھا دور ہے۔ انسان ہر زمانے میں اپنے اندر کچھ آرزوئیں لے کر پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان آرزوؤں کو صرف اپنی کہانیوں میں ظاہر کرسکتا تھا۔ مگر ساری عمر کی کوشش کے باوجود وہ ان آرزوؤں کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا اور محرومی کے احساس کے ساتھ مرجاتا تھا۔

موجودہ دنیا میں بظاہر اِن آرزوؤں کی تکمیل کا سامان حاصل ہو چکا ہے۔ جس اڑن کھٹولے کا تصور صرف کہانیوں میں پایا جاتا تھا وہ اب ہوائی جہاز کی صورت میں ایک واقعہ بن چکا ہے۔ جو عالمی کمیونی کیشن صرف افسانوی کبوتر کے ذریعے متصور ہوتا تھا وہ اب جدید کمیونی کیشن

کے ذریعے ایک عملی واقعہ بن چکا ہے۔

یہی معاملہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہوا ہے۔قدیم زمانے کے تمام خواب آج بظاہر واقعہ بن چکے ہیں۔قدیم زمانے کے افسانوی شہر اب بظاہر عملاً بنائے جا چکے ہیں جن کے اندر دنیا بھر میں عورت اور مرد رہ رہے ہیں۔قدیم زمانے کی افسانوی زندگی اب بظاہر واقعہ بن چکی ہے۔

لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کا سوال ہے، انسان آج بھی حقیقی خوشی حاصل نہ کرسکا۔درخت کی شاخوں پر چہچہانے والی چڑیاں خوش ہوں گی لیکن انسان اب بھی خوشی سے محروم ہے۔آج دنیا کے بازار میں ہر چیز مل سکتی ہے،مگر سکون کا سرمایہ کسی بازار میں میسر نہیں۔

اِس اَلم ناک صورتِ حال کا واحد سبب ایک ہے۔اور وہ ہے — صرف قبل از موت دورِ حیات (pre-death period) کو سامنے رکھ کر زندگی کو اکسپلین کرنے کی کوشش کرنا۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ایک بعد از موت دورِ حیات (post-death period) ہے، اور اس ابدی دورِ حیات کو شامل کیے بغیر زندگی کی اطمینان بخش توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ خالق کے کریشن پلان (creation plan) کے مطابق، انسان کی زندگی دو دَوروں میں تقسیم ہے — قبل از موت دَور، اور بعد از موت دَور۔قبل از موت دَور کی مدتِ حیات گویا فصل بونے کی مدت ہے، اور بعد از موت دَور کی مدتِ حیات گویا پھل حاصل کرنے کی مدت۔اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ فصل کے بغیر پھل نہیں اور پھل کے بغیر زراعت کی کوئی معنویت نہیں۔انسانی زندگی کے اِس معاملے کو جانے بغیر، انسانی زندگی کی اطمینان بخش توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔

قدیم شرک، جدید شرک

موجودہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کے دو راستے ہیں — سیدھا راستہ اور بھٹکاؤ کا راستہ (16:9)۔سیدھا راستہ یہ ہے کہ آدمی خالق کو اپنی زندگی میں مرکزی مقام دے، وہ خالق کو اپنا سب کچھ بنا لے۔بھٹکاؤ کا راستہ یہ ہے کہ آدمی مخلوق میں گُم ہو جائے، وہ مخلوق کی نسبت سے اپنی زندگی کا پورا نقشہ بنائے۔پہلے طریقے کا نام توحید ہے، اور دوسرے طریقے کا نام شرک ہے۔ہماری کائنات میں

صرف دو چیزیں ہیں— خالق اور مخلوق۔ خالق کو اپنا کنسرن بنانے کا مذہبی نام توحید ہے، اور مخلوق کو اپنا کنسرن بنانے کا مذہبی نام شرک۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسانیت کے آغاز ہی سے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبر آتے رہے اور انسان کو صحیح اور غلط کی رہ نمائی دیتے رہے۔ ہر پیغمبر کا مشن ایک ہی تھا— انسان کو توحید کی طرف بلانا، اور اس کو شرک سے بچنے کی تلقین کرنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں توحید ایک تھی، اسی طرح شرک بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔

قدیم شرک یا شرک کا قدیم ورژن (ancient version of shirk) نیچر پرستی (nature worship) پر قائم تھا۔ نیچر کی حیثیت مخلوق کی ہے۔ قدیم زمانے کے انسان نے نیچر کو معبود کا درجہ دے دیا۔ وہ نیچر پرستی (nature worship) کی بُرائی میں مبتلا ہوگیا، یعنی خالق کی پرستش کے بجائے مخلوق کی پرستش کرنا۔ اِسی کو مظاہرِ فطرت کی پرستش کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی یہ شرک اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ آج کا انسان بھی یہی کررہا ہے کہ وہ خالق کے بجائے مخلوق کو اپنا سب کچھ (supreme concern) بنائے ہوئے ہے۔ قدیم شرک اور جدید شرک کے درمیان جو فرق ہے، وہ ظاہر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ حقیقت کے اعتبار سے۔

قدیم انسان نے نیچر کو پرستش کا موضوع (object of worship) بنایا تھا۔ جدید انسان نے نیچر کو تفریح کا موضوع (object of entertainment) بنالیا ہے۔ جذباتِ عُبودیت کا مرکز پہلے بھی مخلوقات تھیں، اور اب بھی جذباتِ عبودیت کا مرکز مخلوقات ہیں۔

موجودہ زمانے کے انسان کا نظریہ یہ ہے کہ اپنے آج (now) میں خوش رہو، کل کی فکر چھوڑ دو۔ یہ ''آج'' کیا ہے۔ یہ وہی سامانِ حیات ہے جو ہم کو نیچر کی صورت میں ملا ہے۔ یہ سامانِ حیات خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ تفریح کے سامانوں میں سے کوئی بھی سامان انسان نے خود نہیں بنایا، وہ اس کو خالق کی طرف سے ملا ہے۔ یہ خالق ہے جو ساری چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ آج کے انسان نے

یہ کیا کہ اُس نے نعمت (blessing) کولیا، اور منعم (giver) کو چھوڑ دیا۔ یعنی خالق رُخی نظریے کو ترک کر کے، مخلوق رخی نظریے کو اختیار کرلیا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ اُس کو جب کوئی چیز ملے تو وہ دینے والے کا اعتراف کرے۔ احساسِ تشکُّر (gratitude) انسان کی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ موجودہ زمانے میں انسان نے دوبارہ یہ کیا کہ اُس نے اپنے احساسِ تشکر کو خالق کے بجائے مخلوق کی طرف موڑ دیا۔ جو قلبی اعتراف اس کو مُنعم کے لیے پیش کرنا چاہیے تھا، اُس کو وہ منعم کی پیدا کردہ مخلوق کے لیے پیش کرنے لگا۔

آج کل کے لوگوں کی باتیں سنیے، یا ان کی تحریریں پڑھیے تو بار بار اِس قسم کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے روزانہ کے تجربات میں اِس کے نمونے دیکھ سکتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں ایک حوالہ نقل کروں گا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (27 جنوری 2008) میں اِس موضوع پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اِس کے لکھنے والے کا نام ڈونا (Donna Devane) ہے۔ اِس مضمون کا عنوان یہ ہے:

Be happy here and now.

آج کل کے زمانے میں انسان ایک عام مسئلے سے دوچار ہے۔ وہ ٹنشن یا اسٹریس (stress) ہے۔ یہ ٹنشن کیوں ہے، اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کو اُس کی مطلوب خوراک نہیں دے رہا ہے۔ وہ خالق کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے بھرپور انتفاع کررہا ہے، لیکن وہ خالق کا اعتراف نہیں کرتا۔ یہ بے اعترافی، یا عدم تشکر فطرت کے خلاف ہے۔

اِس لیے وہ انسان کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر ٹنشن یا اسٹریس کا سبب بنا ہوا ہے۔ موجودہ انسان نے اِس کا یہ غیر فطری حل دریافت کیا ہے کہ دینے والے کے بجائے، خود دی ہوئی چیزوں پر تشکر کا اظہار کرنا۔ مذکورہ مضمون اِسی جدید ذہن کی نمائندگی کررہا ہے۔ چناں چہ اس میں

کہا گیا ہے کہ — تم ملی ہوئی چیزوں پر خوب تشکر کا اظہار کرو اور تم ٹنشن سے بچ جاؤ گے۔ اِس سلسلے میں مضمون نگار کے الفاظ یہ ہیں:

Gratitude feels my soul as I enjoy my computer, more about my home, enjoy the feeling of a hug from my daughter. There is so much to be grateful for each moment of each day. I find that where gratitude goes, joy flows, spend a few moments throughout the day with thought shifter statements. A few of the thought shifter statements that I use are— I am so happy and joyful to believe. I am so happy and grateful for this wonderful mind, and body that allows me to enjoy touch, taste, sound, and movement. I am so happy and grateful for my family, and friends, and the love we share. I am so happy and grateful for my home and utilities. I am so happy and grateful for my computer, my internet, my ability to type and share with friends all over the world.

انسان کے اندر جس طرح بھوک اور پیاس کا طاقت ور جذبہ موجود ہے، اُسی طرح یہ جذبہ بھی انسان کے اندر نہایت طاقت ور شکل میں موجود ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسان کا اعتراف کرے۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ اُس کو کسی سے کوئی بڑی چیز ملے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ آدمی کا فطری مزاج یہ ہے کہ جب اُس کو کسی سے کوئی بڑا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی پوری شخصیت چاہتی ہے کہ چیخ کر وہ اس کا اعتراف کرے۔ یہ انسان کی ایک ایسی صفت ہے جس سے کوئی بھی عورت یا مرد خالی نہیں۔

انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ سب خدا کا عطیہ ہے۔ خواہ اس کا اپنا وجود ہو یا اس کے باہر کا وہ پورا انظام جس کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے، سب کا سب اس کو خدا کی طرف سے یک طرفہ عطیہ کے طور پر ملا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ اِن تمام عطیات (blessings) کے لیے ان کے مُعطی (giver) کا بھر پور اعتراف کرے۔ اِن عطیات میں سے ایک قسم اُن عطیات کی ہے جو براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے انسان کو مل رہے ہیں۔

مثلاً ہوا اور پانی اور روشنی، وغیرہ۔ اور دوسری چیزیں وہ ہیں جو بالواسطہ طور پر خدا کا عطیہ ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو انسان نے عالمِ فطرت میں دریافت کرکے خدا کی دی ہوئی عقل کے ذریعے اُن کو مختلف قسم کی مصنوعات میں تبدیل کیا ہے۔ مثلاً تمام قسم کے کنزیومر گڈس (consumer goods)۔

یہ تمام عطیات تقاضا کرتے ہیں کہ انسان اپنے سارے دل اور سارے دماغ کے ساتھ اُن کا اعتراف کرے۔ لیکن خود ساختہ فلسفوں کے تحت، انسان نے یہ کیا کہ اُس نے عطیات کو لیا، اور اُن کے معطی (giver) کو حذف کردیا۔ یہ ایک بھیانک غلطی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی فطرت ایڈریس ہونے سے رہ گئی:

The human nature was left unaddressed.

یہ کسی انسان کے لیے ایک داخلی تضاد کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانے میں تمام عورت اور مرد اِسی داخلی تضاد میں جی رہے ہیں۔ موجودہ زمانے کا وہ مسئلہ جس کو ٹنشن اور اسٹریس کہا جاتا ہے، وہ براہِ راست طور پر اِسی داخلی تضاد کا نتیجہ ہے۔

اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28) یعنی اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے:

Peace of mind can be achieved only through the remembrance of God.

جنّت: ایک آفاقی تصور

پیراڈائز (جنت) کا تصور تمام انسانی سماجوں میں پایا گیا ہے۔ پیراڈائز تمام عورتوں اور مردوں کا ایک عالمی خواب ہے۔ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے، وہ ایک خوب صورت دنیا کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی کو پیراڈائز کہا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان ایک متلاشیٔ جنت حیوان (Paradise-seeking animal) ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ پیراڈائز کا تصور ہر سماج میں اور ہر کلچر میں ہمیشہ پایا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے پیراڈائز ایک عالمی لفظ ہے۔ معمولی تغیر کے ساتھ وہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کا لفظ فردوس (18: 107) بھی خود پیراڈائز ہی کی ایک معرّب (Arabicized) صورت ہے۔ ذیل میں چندزبانوں کی مثالیں درج کی جاتی ہیں، جس سے پیراڈائز کی عالمی نوعیت کا اندازہ ہوگا:

Avesta	:	Pairidaêza	Persian	:	Firdaus
Greek	:	Paradeisas	Latin	:	Paradisus
French	:	Paradis	English	:	Paradise
Hebrew	:	Pardes	Akkadian	:	Pardesu
Aramaic	:	Pardaysa	Sanskrit	:	Paradesha
Arabic	:	Firdaus			

پیراڈائز (جنت) کا تصور انسانی فطرت میں اتنا زیادہ پیوست ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ پیراڈائز کو پانا، ہر عورت اور مرد کا مشترک خواب ہے، خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر عورت اور مرد نے عالمِ تصور میں ایک انتہائی خوب صورت دنیا کو پہلے سے دیکھا ہے، اوراب وہ اِس دیکھی ہوئی جنت کو عملی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی اِس خواہش کے تحت، پیراڈائز کے تقریباً ایک درجن ماڈل بن گئے ہیں۔ ہر انسان اپنے اِس معلوم ماڈل کو واقعاتی طور پر حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔

پیراڈائز کا مطالعہ میری پوری زندگی میں شامل رہا ہے۔ تاریخ میں پیراڈائز کے جتنے ماڈل بنائے گئے ہیں، تقریباً اُن سب کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے طویل مطالعے اور تجربے کے بعد پایا ہے کہ پیراڈائز کا صرف وہی ماڈل مطابقِ فطرت ماڈل ہے جو قرآن میں ملتا ہے۔ بقیہ تمام ماڈل یا تو فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے، یا وہ صرف جزئی طور پر فطرت کے مطابق ہیں۔ اور یہ دونوں حالتیں اُن کو نا قابلِ قبول قرار دے دیتی ہیں۔

اِس فہرست میں صرف قرآن کا ماڈل واحد قابلِ قبول ماڈل ہے۔ اِسی لیے قرآن میں سچے انسانوں کی بابت یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا اُن کو ایسی جنت میں داخل کرے گا جس کی اُس نے اُنھیں خوب پہچان کرادی ہے: وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (47: 6)۔ جنت کے معروف ماڈلوں میں سے کون سا ماڈل درست ہے، اس کا معیار وہی اصول ہے جس کو اِس طرح کے معاملات میں سائنس میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی اصولِ مطابقت (principle of corroboration)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نظریے کی صحت کو معلوم کرنے کے لیے یہ کیا جائے گا کہ اُس کو تمام متعلق (relevant) واقعات یا مظاہر کی نسبت سے جانچا جائے گا۔ اگر یہ نظریہ تمام متعلق چیزوں سے مطابقت (corroborate) کر رہا ہو تو اس کو درست مان لیا جائے گا اور اگر کوئی ایک واقعہ بھی اس نظریے سے مطابقت نہ کرے تو اس نظریے کو غلط قرار دے کر اُس کو رد کر دیا جائے گا۔

یہی واحد اصول ہے جس کی روشنی میں پیراڈائز کے مختلف تصورات کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اُن میں سے کون سا نظریہ درست نظریہ ہے۔ ذیل میں اِسی اصول کی روشنی میں پیراڈائز کے مختلف ماڈلوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اِس مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ سائنٹفک طریقِ مطالعہ کے مطابق، اِن میں سے کون سا ماڈل علمی طور پر قابلِ قبول ماڈل ہے۔

بدھسٹ ماڈل

سب سے پہلے بُدھسٹ ماڈل (Buddhist model) کو لیجئے۔ بدھ ازم میں اگرچہ مہایانا (Mahayana) اسکول کو چھوڑ کر، بقیہ کسی اسکول میں پیراڈائز کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔

لیکن اصولی طور پر بدھ ازم میں پیراڈائز کا تصور موجود ہے۔ بدھ ازم کے نظریے کے مطابق، انسان پُنر جنم (re-birth) کے ذریعے لمبا ارتقائی سفر کرتا ہے۔ اِس ارتقائی سفر کے دوران وہ ہر قسم کی خواہشوں سے مکت ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ انسانی ارتقا کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے، جو بدھسٹ نظریے کے مطابق، ابدی سعادت (eternal bliss) کی منزل ہے۔

مگر یہ بدھسٹ ماڈل واضح طور پر انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔ انسان ایک باشعور مخلوق ہے۔ انسان کے لیے اعلیٰ یافت وہی ہوسکتی ہے جو شعور کی سطح پر اُس کو ملے، لیکن بدھسٹ ماڈل میں لاکھوں سال کا پورا سفر، اور آخری منزل سب بے شعوری کی حالت میں طے ہوتے ہیں۔ انسان نہ تو حالتِ سفر میں شعوری طور پر اِس عمل (process) سے باخبر رہتا ہے اور نہ وہ سفر کے خاتمے پر شعوری طور پر اس کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدھسٹ ماڈل انسان کے لیے ناخوش گوار باتوں سے بے خبری کا سُکھ (blissful ignorance) ہے، وہ انسان کے لیے حقیقی معنوں میں مطلوب سعادت نہیں۔

یہودی ماڈل

اس کے بعد یہودی ماڈل (Jewish model) کو لیجئے۔ اِس ماڈل میں اگر چہ پیراڈائز کا تصور موجود ہے، لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ موجودہ یہودیت کے مطابق، اس کی بنیاد ایک مخصوص نسل پر رکھی گئی ہے۔ موجودہ یہودیت کا ماننا ہے کہ یہودی نسل ایک منتخب گروہ (chosen people) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی منتخب گروہ پیراڈائز کا حق دار ہے۔ یہ تصور انسان کی آفاقی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اِس لیے علمی اعتبار سے وہ درست نہیں قرار پاسکتا۔

مسیحی ماڈل

یہی معاملہ کرسچن ماڈل (Christian model) کا ہے۔ موجودہ مسیحیت میں پیراڈائز کے وجود کو مانا گیا ہے۔ لیکن موجودہ مسیحیت کے مطابق، پیراڈائز کا استحقاق عقیدۂ کفّارہ (atonement) سے جڑا ہوا ہے، یعنی آدم کی خطا کے بعد تمام انسان پیدائشی طور پر گنہ گار اور پیراڈائز سے محروم ہو چکے ہیں۔ اب پیراڈائز صرف ان عورتوں اور مردوں کے لیے ہے، جو اِس عقیدے کو مانیں کہ

مسیح مصلوب ہو کر اُن کی طرف سے ان کے تمام گناہوں کا کفّارہ بن گئے ہیں۔

موجودہ مسیحیت کا یہ تصور بھی انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پیدائشی گناہ (original sin) کا نظریہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہو سکتا ہے، لیکن وہ انسان کی فطرت کے اعتبار سے بالکل اجنبی ہے۔ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ جو شخص کوئی بُرا عمل کرے، وہی اپنے عمل کی سزا بھگتے۔ گناہ کوئی اور شخص کرے اور اس کی گنہ گاری پیدائشی طور پر کسی اور شخص تک پہنچ جائے، یہ وراثتی گنہ گاری (hereditary sin) ہے۔ اور وراثتی گنہ گاری کا نظریہ انسانی فطرت سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

تہذیبی ماڈل

اِسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جس کو تہذیبی ماڈل (civilizational model) کہا جا سکتا ہے۔ تہذیب (civilization) سے مراد ہے — سماجی ترقی کا برتر مرحلہ:

An advanced stage or system of social development.

موجودہ زمانے میں جب تہذیبی ترقی یہاں تک پہنچی کہ نئی قسم کی ٹکنالوجی اور نئی قسم کی ترقی انسان کی دست رس میں آ گئی، تو یہ سمجھا جانے لگا کہ اب پیراڈائز کے لیے ایک اور دنیا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اِسی دنیا میں انسان اپنی پیراڈائز آپ بنا سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان اب اِس پوزیشن میں ہو گیا ہے کہ وہ اپنی پیراڈائز آپ بنا سکے۔ لیکن جلد ہی یہ خواب منتشر ہو گیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ پیراڈائز کو تعمیر کرنے والی انڈسٹری اپنے آخری اسٹیج میں پہنچ کر ایک نئے قسم کا جہنم وجود میں لانے کا سبب بن رہی ہے۔ اس نئے جہنم کا نام موجودہ زمانے میں گرین ہاؤس گیس (green house gas) ہے، یعنی دنیا کا ایسی مضر گیسوں سے بھر جانا جس میں انسان کی زندگی ہی ممکن نہ رہے۔

اِس تجربے نے بتایا کہ پیراڈائز کو وجود میں لانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution free industry) درکار ہے، اور تمام تجربات بتاتے ہیں کہ بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس طرح تہذیبی جنت کا نظریہ،

پیراڈائز کو وجود میں لانے سے پہلے ہی اپنی آخری ناکامی کے ساتھ ختم ہوگیا۔

بھلاوہ کلچر

پیراڈائز کے معاملے میں ایک اور قسم کا تصور بہت اہم ہے۔ اس کو تمثیل کی زبان میں آسٹرچ پیراڈائز (ostrich paradise) کہا جاسکتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا تصور ہے جن کے سامنے پیراڈائز کی بات کہی جائے تو وہ اپنا یہ فارمولا پیش کردیں گے — آج کی بات آج، کل کی بات کل۔ اُن کا کہنا ہے کہ ابھی اور آج جو کچھ مل رہا ہے، اُس کو حاصل کرو۔ ایک لفظ میں اُن کا فارمولا یہ ہے:

right here, right now

ان کی زندگی اِس نظریے پر مبنی ہے کہ — محنت سے پیسہ کماؤ اور عیش کی زندگی گزارو:

work hard, party hard

اِس نظریے کی صحت کو جانچنے کے لیے ہمیں اس کو نتیجہ (result) کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا، اور جب نتیجے کے پہلو سے اِس نظریے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ جو لوگ اِس قسم کے الفاظ بولتے ہیں، وہ خود اِس کا مثبت نتیجہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ بظاہر یہ خوب صورت الفاظ ہر ایک کے لیے صرف منفی نتیجہ لے کر سامنے آئے ہیں۔

اِس قسم کے لوگ زیادہ پیسہ کماتے ہیں، مگر زیادہ پیسہ صرف ان کے لائف اسٹائل اور ان کی غذائی عادت (food habit) کو بگاڑ دیتا ہے، جس کے نتیجے میں شوگر، بلڈ پریشر اور کینسر جیسی مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ پیسہ کما کر یہ لوگ اپنا اسٹریس (stress) دور کرنے کے لیے آؤٹنگ پر جاتے ہیں، لیکن جب وہ اپنی آؤٹنگ سے لوٹتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نیا مسئلہ ہالی ڈے اسٹریس (holiday stress) کی صورت میں لے کر واپس آئے ہیں۔

زیادہ پیسہ کما کر وہ اپنی شاپنگ کو بڑھاتے ہیں، لیکن اُس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سطحی چیزوں میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے اُس چیز سے محروم ہوجاتے ہیں، جس کو اعلیٰ سوچ (high thinking) کہا جاتا ہے۔ زیادہ پیسہ کما کر وہ لَو افئر (love affair) کا کلچر چلاتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ برعکس طور پر

ہیٹ افئر (hate affair) کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگ فیملی لائف کی خوشی سے یک سر محروم ہو کر رہ جاتے ہیں، وغیرہ۔

بالفرض اِس قسم کا کوئی انسان اپنے نظریے کے منفی انجام سے بچ جائے، تب بھی یہ واقعہ تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ لازمی طور پر پیش آتا ہے کہ وہ سو سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی بوڑھا ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہے اور اس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسپتال میں داخل ہو جائے اور پھر اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک دن اِس دنیا سے چلا جائے۔

اِس کی ایک مثال 12 جنوری 2008 کے اخبارات میں سامنے آئی ہے۔ نیوزی لینڈ کے سر ایڈ منڈ ہیلیری نہایت طاقت ور انسان تھے۔ جب وہ کوہ پیمائی کرتے ہوئے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ (Everest) پر پہنچ گئے تو ساری دنیا کے اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی۔ وہ فاتحِ ایورسٹ کہے جانے لگے۔ جب انھوں نے ایورسٹ کی چوٹی پر قدم رکھا تھا تو اس وقت اُن کی زبان سے یہ پُرفخر الفاظ نکلے تھے:

To my great delight, I realized we were on top of Mount Everest and the whole world spread out below us.

(*The Times of India*, New Delhi, January 12, 2008, p. 12)

لیکن 11 جنوری 2008 کو جب 88 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو وہ اسپتال کے بستر پر ایک نہایت کم زور انسان کی حیثیت سے پڑے ہوئے تھے اور ان کے سامنے اس کے سوا کوئی اور انتخاب (option) نہ تھا کہ موت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے وہ اپنے تمام اثاثے اور اپنی تمام تمناؤں کے ساتھ اِس دنیا کو چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں چلے جائیں، جس کا سامنا کرنے کے لیے اُن کے پاس بظاہر کچھ بھی موجود نہ تھا۔

قرآنی ماڈل

اب پیراڈائز کے بارے میں قرآنی ماڈل (Quranic model) کو لیجئے۔ اِس معاملے میں قرآن کا ماڈل، خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) پر مبنی ہے۔ قرآن کے مطابق،

خداوندِ عالم کا تخلیقی پلان اور پیراڈائز دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح جُڑے ہوئے ہیں۔ اِسی لیے قرآن کے مطابق، پیراڈائز کے معاملے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خداوندِ عالم کے تخلیقی پلان کی روشنی میں سمجھا جائے۔

قرآن، خدا کی کتاب ہے۔ وہ پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ قرآن کے مطابق، خدا نے انسان کو بنایا اور اس کو موجودہ زمین پر آباد کیا۔ یہ آبادکاری بطور امتحان تھی، نہ کہ بطور انعام، یعنی یہ آبادکاری اِس لیے تھی کہ دنیا کی عارضی زندگی میں انسان اپنے آپ کو پیراڈائز کا اہل ثابت کرے اور پھر موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں اس کو اس کے عمل کے مطابق، پیراڈائز میں بسایا جائے۔

اِس اعتبار سے موجودہ دنیا گویا کہ ایک انتخابی میدان (selection ground) ہے۔ یہاں آدمی کو مختلف قسم کے احوال میں رکھ کر جانچا جارہا ہے کہ کون اپنے عمل سے اِس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے۔ جو لوگ اِس جانچ میں پورے اتریں، ان کو منتخب کرکے جنت کی ابدی دنیا میں داخل کردیا جائے گا۔ اور جو لوگ اِس جانچ میں ناکام ہوگئے، اُن کو ابدی طور پر کائنات کے کوڑے خانے (جہنم) میں ڈال دیا جائے گا۔

قرآن کے مطابق، یہ جنت ابدی ہوگی اور اِسی کے ساتھ ایک معیاری اور آئڈیل جنت۔ یہاں یہ ممکن ہوگا کہ انسان ہر قسم کے خوف اور ہر قسم کے حزن سے بچ کر زندگی گزارے۔ جنت کی یہ دنیا ہر قسم کے ناموافق حالات (disadvantages) اور ہر قسم کی محدودیت (limitations) سے خالی ہوگی۔ یہاں انسان وہ سب کچھ پالے گا جس کی تمنا وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

جنت کی اِس دنیا میں آدمی کی تمام خواہشیں (desires) پوری ہوں گی۔ یہاں اُس کو مکمل فلفل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ موجودہ دنیا میں بھی اگر چہ تمام اچھی چیزیں موجود ہیں، لیکن یہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے، جب کہ جنت کی دنیا ہر اعتبار سے ایک معیاری دنیا (perfect world) ہوگی۔ جنت کی دنیا میں نہ شور ہوگا اور نہ کسی قسم کی کثافت۔ یہ دنیا ہر قسم کی منفی باتوں سے خالی ہوگی۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اور جنت ایک کامل دنیا ہوگی۔ اور کسی معاملے میں

ناقص نمونے کا وجود میں آنا، اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کامل نمونہ بھی وجود میں آ سکتا ہے۔ یہی ہے جنت کا قرآنی ماڈل۔ یہ ماڈل بلاشبہہ فطرت کے تقاضے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ تمام متعلق مظاہر سے مطابقت (corroborate) کر رہا ہے۔

پیراڈائز کے قرآنی ماڈل کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں آدمی کامل شعور کے ساتھ اور اپنے مائنڈ کی اعلیٰ ترقیاتی سطح پر جئے گا۔ یہ جنت انسان کے لیے نہ کوئی محدود دنیا ہوگی اور نہ ایسا ہوگا کہ وہ شعور سے کم ترکسی سطح پر اُس کو حاصل ہوگی۔

پیراڈائز کے بارے میں قرآنی ماڈل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کوئی پراسرار (mysterious) جگہ نہیں ہوگی، بلکہ وہ ہماری دنیا جیسی ایک جگہ ہوگی۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جنت میں وہ تمام اچھی چیزیں اہلِ جنت کو ملیں گی، جو اُنھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھیں، مگر یہ تمام چیزیں نہایت اعلیٰ صورت میں ہوں گی۔ اِسی طرح جنت میں اس کے باشندوں کو ہر قسم کی سرگرمیوں کا موقع ہوگا، مگر یہ سرگرمیاں اوّل سے آخر تک پُرکیف ہوں گی۔ وہاں نہ کوئی بورڈم ہوگا اور نہ کوئی تکان۔ مزید یہ کہ دنیا میں آدمی چیزوں سے محظوظ ہونے کی بہت کم طاقت رکھتا ہے۔ جنت میں ایسا ہوگا کہ وہاں کے باشندوں کو چیزوں سے انجوائے کرنے کی لامحدود طاقت حاصل ہوگی۔ اورسب سے بڑھ کر یہ بات کہ پیراڈائز کے قرآنی ماڈل میں انسان، خدا کے پڑوس میں رہنے کا موقع پالے گا، جو کہ ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کا اتھاہ خزانہ ہے۔

معرفت کا سفر

نومبر 1959 کا واقعہ ہے۔آریہ سماج نے اپنی گولڈن جُبلی (golden jubilee) منائی۔ اِس سلسلے میں مختلف مقامات پر ان کے پروگرام ہوئے۔بجنور (سیوہارہ) میں 29 نومبر 1959 کو ایک آل مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اِس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بلایا گیا۔اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کی روشنی میں ایک سوال کا جواب دیں۔ وہ سوال یہ تھا— گیان کا آغاز کس طرح ہوا:

How was the beginning of knowledge.

اِس کانفرنس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی، اِس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد عبدالحی رام پوری (وفات: 1987) بھی تھے۔اِس کانفرنس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہاں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ''اسلام کا تعارف'' کے نام سے ایک پمفلٹ کی صورت میں چھپ چکی ہے۔ اِس کانفرنس کے چیرمین مرادآباد کے ایک ہندو وکیل تھے۔ وہ خود بھی آریہ سماج کے ایک ممبر تھے۔انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ — تمام تقریروں میں صرف ایک تقریر تھی جو موضوع سے متعلق (relevant) تھی اور وہ مولانا صاحب کی تقریر تھی۔بقیہ تقریروں میں اصل سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔

اُس وقت میں نے انگریز مصنف جولین ہکسلے (Sir Julian Sorell Huxley) (وفات: 1979) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ کچھ لوگ زندگی اور کائنات کو صرف ایک حادثاتی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں اور ملین اور ملین سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں، تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شیکسپیئر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے۔ اِس طرح ملین اور بلین سال تک مادّے کے اندھے عمل کے دوران بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

اِس طرح کی مثالیں یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے دی جاتیں ہیں کہ اِس دنیا میں زندگی کا سفر

کوئی شعوری سفر نہیں، وہ صرف بے شعوری کا ایک معاملہ ہے۔ افکار کی تاریخ اتفاقی اسباب کے تحت پیش آنے والے ایک بے شعوری سفر کی کہانی ہے۔ لیکن راقم الحروف کے مطالعے کے مطابق، یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت کا سفر مکمل طور پر شعور کے تحت پیش آنے والا ایک سفر ہے۔ وہ ایک ابتدائی منزل سے اپنی آخری منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ معرفت کا سفر انسان کی ایک شعوری ضرورت ہے۔ یہ ہر انسان کی ایک ذاتی ضرورت ہے، خواہ اس نے اِس کا اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

گیان (معرفت) کے آغاز کا سوال ایک نہایت سنجیدہ سوال ہے۔ میں برابر اِس تلاش میں رہا ہوں کہ اِس سوال کا زیادہ واضح جواب معلوم کروں۔ یہ سوال میرے ذہن میں تقریباً 40 سال تک رہا۔ حال میں انتھراپالوجی (Anthropology) کے ایک سروے میں مجھے اس کا جواب ملا۔ محققین کے مطابق، یہ جواب آرکیالوجی کے شواہد (archaelogical findings) پر مبنی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اسٹون ایج (stone age) میں دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مارنے کے لیے ایک دوسرے کی طرف پتھر پھینکا۔ دونوں پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اِس ٹکرانے کے سبب سے وہاں اسپارکنگ (sparking) ہوئی، یعنی دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاری نکلی۔ یہ ظاہرہ دونوں آدمیوں کے لیے نیا تھا۔ اب وہ دونوں آپس کا اختلاف بھول کر وہاں بیٹھ گئے اور دو پتھروں کو آپس میں ٹکرا کر چنگاری نکالنے لگے۔

دو پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاری کیوں نکلتی ہے۔ اِس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خود اِن پتھروں کے اندر پہلے سے چنگاری موجود ہوتی ہے اور وہ ٹکراؤ کے وقت ان کے اندر سے نکل آتی ہے، بلکہ اِس چنگاری کا سبب خارج میں ہے۔ اصل یہ ہے کہ فضا میں مختلف قسم کی گیسیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوا اِن گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اِن میں سے ایک گیس وہ ہے جس کو ہائڈروجن (hydrogen) کہا جاتا ہے۔ ہائڈروجن ایک بھڑک اٹھنے والی گیس (inflammable gas) ہے۔ جب پتھر کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جاتا ہے تو فضا میں موجود ہائڈروجن کا کچھ حصہ اِس ٹکراؤ کی زد میں آجاتا ہے اور اچانک بھڑک اٹھتا ہے۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا تو بلاشبہہ یہی وہ واقعہ تھا جس سے انسانی تاریخ میں گیان (معرفت) کا آغاز ہوا۔ اِس واقعے کا ایک نہایت اہم پہلو تھا، وہ یہ کہ اس واقعے نے انسان کو بتایا کہ معلوم یا مشہود دنیا کے ماورا ابھی ایک دنیا موجود ہے:

There is an invisible dimension beyond the visible world.

یہ مسئلہ ہسٹری آف تھاٹ (History of Thought) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ہسٹری آف تھاٹ کے بارے میں ماضی کے بہت کم واقعات تاریخ میں ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اِس لیے اس معاملے میں کوئی تفصیلی نقشہ نہیں بنایا جاسکتا۔ تاہم قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالباً یہی واقعہ تھا جس سے انسانوں کے درمیان گیان (معرفت) کے سفر کا آغاز ہوا اور پھر ایک کے بعد ایک، چیزیں دریافت ہوتی چلی گئیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر دریافت نے صرف یہ بتایا کہ اس کے آگے بھی علم کی کوئی سطح موجود ہے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئی:

Every discovery tells us that there is something more to discover.

مثلاً حضرت مسیح سے ہزار سال پہلے عراق میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے وقت کے بادشاہ نمرود (Nemrud) کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ یہ خدا ہے جو سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے اور اس کو مغرب کی طرف لے جاتا ہے۔ کوئی انسان اس نظام کو بدلنے پر قادر نہیں۔ یہ سادہ انداز میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ تھا جس کو بعد کے زمانے میں علماءِ فلکیات (astronomers) نے دریافت کیا، یعنی زمین اپنے لمبے مدار (orbit) پر گردش کرنے کے علاوہ اپنے محور (axis) پر گھومتی ہے جس سے رات کے بعد دن پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی آخری بات نہ تھیں۔ اس دریافت نے انسان کے اندر مزید جستجو کے دروازے کھولے اور بعد کو خلائی اجرام کے بارے میں نئی نئی دریافتیں ہوئیں۔

اِسی طرح تیسری صدی قبل مسیح میں یونان میں مشہور اسکالر ارشمیدس (Archimedes) پیدا ہوا۔ اس کے ہم عصر بادشاہ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اِس سوال کا جواب دے کہ کشتی پانی میں کیسے تیرتی ہے اور

اس کا قانون کیا ہے۔ ارشمیدس اِس سوال کا جواب تلاش کرنے میں مشغول ہوگیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ پانی کے ٹب میں نہا رہا تھا۔ اِس دوران ایک موقع پر اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا جسم پانی کے اوپر تیر رہا ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے اس نے وہ سائنس دریافت کی جس کو ہائیڈرو اسٹیٹک (hydro static) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت کا خلاصہ یہ تھا کہ جب پانی میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے تو وہ پانی کی جتنی مقدار کو ہٹاتی (displace) ہے، اسی کے بقدر وہاں اوپری دباؤ (upward pressure) پیدا ہوتا ہے۔ اِسی فطری عمل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کشتی پانی میں تیرنے لگتی ہے:

Hydrostatics: upward thrust exerted on a body immersed in fluid equals weight of fluid displaced.

اِس طرح، انسان ایک کے بعد ایک دریافتیں کرتا رہا، مگر یہ تمام دریافتیں طبیعیات کے دائرے میں تھیں۔ آخر کار معلوم ہوا کہ طبیعیات (physics) کے ماورا بھی ایک دنیا ہے۔ اِس فوق الطبیعی دنیا کے بارے میں عام ذرائع سے کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح ایک وقت آیا، جب کہ انسانی سائنس اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ اِس آخری حد کے بعد علم کا جو اگلا مرحلہ ہے، اِس میں سائنس براہِ راست مددگار نہیں ہوسکتی۔

یہی وہ مقام ہے، جہاں سے پیغمبرانہ رہنمائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ آدمی طبیعیات کی دنیا میں بطور خود واقفیت حاصل کرسکتا ہے، لیکن بالائے طبیعیات جو دنیا ہے، اس کے بارے میں صرف پیغمبر کے ذریعے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پیغمبر، خدائی وحی کے ذریعے بولتا ہے، نہ کہ انسانی تجربات کے ذریعے۔ یہ پیغمبرانہ رہنمائی اب قرآن کی شکل میں موجود ہے جو محفوظ کلام الٰہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

افکار کی تاریخ

فلسفے کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدیم یونان میں اس کا ابتدائی نشو ونما ہوا۔ یونانی فلاسفہ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مادّہ (matter) قدیم ہے، یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) کا نظریہ یہی تھا۔ بعد کو یونان کے باہر بھی

بڑے بڑے دماغ پیدا ہوئے، جنھوں نے فلسفے کے شعبے میں نمایاں کام انجام دیے۔ تاہم یہ تمام لوگ مادّہ (matter) کو قدیم سمجھنے میں مشترک (common) تھے۔ مگر بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں پہنچ کر کائنات کا یہ قدیم مادّی تصور (material concept) ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ برطانی عالمِ فلکیات سر جیمز جینز (وفات: 1946) کے الفاظ میں یہ تھا کہ — علم کا دریا میکانکل حقیقت (mechanical reality) سے نان میکانکل حقیقت (non-mechanical reality) کی طرف چلا جارہا ہے (*The Mysterious Universe*, p. 138)۔

مذکورہ مادی تعبیر کے تحت یہ نظریہ بنا کہ ہمیں خدا جیسے کسی وجود کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ جس فکری ضرورت کے تحت خدا کے وجود کو مانا جارہا تھا، وہ خود اب مادہ (matter) کے ذریعے پوری ہورہی ہے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ مادّہ نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا۔ تمام موجودات، مادّہ کے اندر اِسی طبیعی اور کیمیاوی سرگرمیوں (physical and chemical activities) کا نتیجہ ہیں۔

مگر بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں بِگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ دریافت ہوا۔ بِگ بینگ کے نظریے نے بتایا کہ پندرہ بلین سال پہلے خلا میں ایک سُپر ایٹم ظاہر ہوا۔ پھر اچانک اس میں ایک دھماکہ (explosion) ہوا۔ اِس سُپر ایٹم کے بے شمار ذرات وسیع خلا میں بکھر گئے، پھر یہ ذرات مختلف فلکیاتی اَجسام (astronomical bodies) کی صورت میں اَن گنت تعداد میں اکھٹا ہوئے، اِس طرح ہماری کائنات وجود میں آئی۔ بِگ بینگ کے نظریے نے کائنات کی قدیم مادّی تعبیر کا خاتمہ کردیا۔ اب خالص علمی اعتبار سے یہ ماننا ممکن ہوگیا کہ اِس کائنات کا ایک خالق موجود ہے۔ وہی اس کو کنٹرول کررہا ہے اور وہی اس کو انتہائی بامعنیٰ طور پر چلا رہا ہے۔

سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) کو ماڈرن سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ نیوٹن کے بعد سائنس میں جو نیا دور آیا، اُس میں کچھ نئی حقیقتیں دریافت ہوئیں۔ انھیں میں سے ایک حقیقت وہ ہے جس کو ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہا جاتا ہے۔ اِس طبیعی قانون نے یہ ثابت کیا کہ کائنات اپنی عمر کے لحاظ سے لامحدود (endless) نہیں ہے۔ اس کی ایک مدت ہے اور

اِس مدت کے پورا ہونے پر اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میری مراد اُس قانون سے ہے جس کو حرکیاتِ حرارت کا دوسرا قانون (second law of thermodynamics) کہا جاتا ہے۔ اِس طبیعی قانون کو دوسرے لفظوں میں، ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہتے ہیں۔ یہ قانون ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی۔ ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اِس چکر کو الٹا نہیں چلایا جاسکتا۔ ناکارگی، دستیاب توانائی (available energy) اور غیر دستیاب توانائی (unavailable energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے۔ اور اِس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے، جب کہ تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبیعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اُسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: *God Arises*، صفحہ 27)

مگر اکیسویں صدی کے آغاز میں صورتِ حال یک سر بدل گئی۔ پچھلے ہزاروں سال کے درمیان فلاسفہ اور مفکرین اور سائنس دانوں نے تہذیبی جنت کو وجود میں لانے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اپنی تکمیل سے پہلے ختم ہو گیا۔ ثابت شدہ حالات کے مطابق، اب اس کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں۔

ہزاروں سال سے انسان کا یہ خواب تھا کہ وہ اپنے لیے اِس دنیا میں ایک بہتر زندگی بنائے۔ انسان کی اِس تمنا نے وہ چیز پیدا کی جس کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر اپنی واضح صورت میں اُس وقت شروع ہوا، جب کہ انسان نے پہیہ (wheel) دریافت کیا۔ لمبے سفر کے بعد تہذیب یہاں تک پہنچی کہ صنعتی انقلاب وجود میں آ گیا اور انسان، موٹر کار اور ہوائی جہاز کے ذریعے تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرنے لگا۔

1970 میں الون ٹافلر کی کتاب فیوچر شاک (*Future Shock*) چھپی۔ اِس میں مصنف نے یہ اعلان کیا کہ انسانی تہذیب اب انڈسٹریل دور سے نکل کر سپر انڈسٹریل دور میں داخل ہونے والی ہے۔

یہ گویا انسان کے تہذیبی سفر کا آخری مرحلہ ہوگا، جب کہ انسان کے تمام مادّی خواب پورے ہوجائیں گے اور انسان مادی راحت کے تمام سامان پالے گا، مگر جلد ہی گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ سامنے آیا اور یہ منصوبہ تکمیل سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ زمانے کی تمام مادی ترقیاں جدید صنعتی انقلاب کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ جدید صنعتی دور، مشینوں کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔ پہلے انسان، فطرت کی پیداوار پر زندگی گزارتا تھا۔ فطرت کا کارخانہ کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر انسان کو اپنی پیداوار دے رہا تھا۔ مگر صنعتی دور میں انسانی ساخت کی مشینوں کو متحرک رکھنے کے لیے مسلسل ایندھن (fuel) کی ضرورت تھی۔ انسانی ساخت کی اِن مشینوں کے حرکت میں آنے سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وہ کاربن ایمیشن (carbon emission) کا مسئلہ تھا۔ شروع میں یہ مسئلہ بظاہر کوئی سنگین مسئلہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن اکیسویں صدی عیسوی کے آتے ہی یہ مسئلہ انتہائی سنگین صورت اختیار کرگیا۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں انسان، فطرت کے فراہم کردہ گھوڑے اور اونٹ پر سواری کرتا تھا۔ یہ گھوڑے اور اونٹ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے تھے۔ گھوڑے اور اونٹ فطرت کی پلوشن فری انڈسٹری (pollution free industry) میں پیدا ہوتے تھے اور خود بھی کوئی پلوشن (کثافت) پیدا کیے بغیر ساری عمر اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ اِس کے مقابلے میں، موجودہ زمانے کی کار اور ہوائی جہاز انسانی ساخت کے کارخانوں میں بنائے گئے ہیں۔ یہ کارخانے لازمی طور پر مہلک قسم کی فضائی کثافت پیدا کرتے ہیں۔ یہ کثافت اب بڑھتے بڑھتے اُس خطرناک نقطے تک پہنچ گئی ہے، جہاں سے اُس کے لیے واپسی ممکن نہیں۔ اب انسان کے لیے اس کی تاریخ کا اگلا مرحلہ صرف یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا سے گزر کر اگلی دنیا میں پہنچ جائے۔

سورہ التین کا پیغام

قرآن کی سورہ التین میں اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کو بتایا گیا ہے۔اِس سورہ کا متن اور ترجمہ یہ ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ○ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (95:1-8) یعنی قسم ہے تین کی اور زیتون کی اور طورِ سینا کی اور اس امن والے شہر کی۔ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔قرآن کے اِس بیان کے مطابق، انسان کو بہترین شخصیت کے ساتھ پیدا کیا گیا، لیکن اس کے بعد انسان کو ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا گیا جو انسان جیسی مخلوق کے لیے اسفل سافلین کی حیثیت رکھتی تھی:

> We have created man in the best of mould, then We cast him down as the lowest of the low.

اسفل سافلین میں ڈالنے سے کیا مراد ہے۔اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور اُن کی بیوی حوا کو پیدا کرنے کے بعد پہلے جنت میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اُن کو (اور ان کی نسلوں کو) موجودہ دنیا (planet earth) میں منتقل کر دیا گیا۔اِس سلسلے میں آیت کے الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (2:38) یعنی ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اترو (زمین پر)۔قرآن کی اِن دونوں آیتوں میں ایک گہری مشابہت ہے۔ "رددنا" اور "اهبطوا" دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں۔ اِس لفظی مشابہت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسفل سافلین سے مراد یہی موجودہ زمین ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جنتی مخلوق کی حیثیت سے

پیدا کیا گیا، پھر اس کو ایک مخصوص منصوبے کے تحت سیارۂ زمین کے اوپر بسا دیا گیا جو کہ تخلیق کے اعتبار سے، جنتی انسان کا ہیبی ٹیٹ (habitat) نہ تھا۔ اسفل سافلین سے مراد کوئی پراسرار چیز نہیں، اس سے مراد موجودہ زمین ہے جو انسان جیسی مخلوق کا مسکن (habitat) نہیں۔

ہیبی ٹیٹ کی اہمیت

ہیبی ٹیٹ کیا ہے۔ ہیبی ٹیٹ ایک ارضیاتی اصطلاح ہے۔ اِس سے مراد وہ جغرافی مقام ہے جو کسی حیوان یا کسی پودے کے لیے فطری طور پر موزوں ہو:

Habitat: The natural abode of an animal or plant.

گویا ہیبی ٹیٹ زمین کا وہ مخصوص علاقہ ہے جو کسی جان دار مخلوق کے لیے موزوں جائے قیام کی حیثیت رکھتا ہو، جہاں وہ حالات موجود ہوں جس میں کوئی جان دار مخلوق بھرپور طور پر نشوونما پا سکے۔

اخروی حقیقتوں کو قابلِ فہم بنانے کے لیے خالق نے دنیا کی زندگی میں حیوانات کے ہیبی ٹیٹ کا ظاہرہ (phenomenon) قائم کیا ہے۔ حیوانات اپنے ہیبی ٹیٹ میں پرسکون طور پر رہتے ہیں۔ ہیبی ٹیٹ کے باہر ان کو سکون نہیں ملتا۔ اس کی ایک مثال مچھلی ہے۔ مچھلی ایک جان دار مخلوق ہے اور اس کا فطری ہیبی ٹیٹ پانی ہے۔ مچھلی پانی کے اندر پرسکون طور پر رہتی ہے، لیکن اگر مچھلی کو پانی کے باہر رکھ دیا جائے، مثلاً کسی محل میں، کسی گارڈن میں، کسی صوفہ سیٹ پر، کسی کار یا ہوائی جہاز میں تو ہر جگہ وہ تڑپتی رہے گی۔ لیکن جیسے ہی آپ اس کو دریا یا سمندر میں ڈالیں، وہ فوراً پرسکون ہو کر اس میں تیرنے لگے گی۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مچھلی اپنی ساخت کے اعتبار سے ہوا سے آکسیجن نہیں لے سکتی۔ مچھلی کے لیے آکسیجن حاصل کرنے کا ذریعہ صرف تحلیل شدہ آکسیجن (dissolved oxygen) ہے جو پانی کے اندر فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا انسان کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کے خالق نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے، جب کہ موجودہ دنیا اِس کے مطابق نہیں۔ انسان اور اس کے رہائشی سیارہ کے درمیان اِسی تبایُن (disparity) کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمین انسان کا فطری ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کو اِس دنیا میں

اُس مچھلی کی طرح رہنا پڑتا ہے جو پانی کے باہر کسی غیر آبی جگہ پر ہو۔اگر چہ اِس دنیا میں پھل اور میوے ہیں، اگر چہ اِس دنیا میں سرسبز پہاڑ ہیں، اگر چہ اِس دنیا میں متمدن آبادیاں ہیں، پھر بھی انسان کو اِس دنیا میں ذہنی سکون حاصل نہیں۔ انسان اپنی زندگی کے اِس تباین پر غور کرے تو وہ ایک عظیم حقیقت کو دریافت کرے گا، وہ یہ کہ موجودہ دنیا اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔

اسفل سافلین کیا ہے

اِس نکتے کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسفل سافلین سے مراد کوئی پر اسرار چیز نہیں ہے۔اس سے مراد یہی موجودہ زمین ہے۔موجودہ زمین کا اسفل سافلین ہونا خود زمین کی نسبت سے نہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے ہے۔انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، معیار پسند ہے۔موجودہ زمین چوں کہ ہر اعتبار سے آئڈیل سے کم (less than ideal) ہے، اِس لیے عملاً وہ انسان جیسی مخلوق کے لیے اسفل سافلین بن جاتی ہے۔اِس نکتے کی وضاحت کے بعد سورہ التین کا پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔اِس سورہ کے ابتدائی الفاظ علامتی الفاظ ہیں۔اِس میں انجیر اور زیتون کے الفاظ سے زمین کی روئیدگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کی بنا پر یہاں پھل اور اناج جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔جبلِ طور سے مراد زمین کے لیے پہاڑوں کی وہ اہمیت ہے جس کا ذکر قرآن کے مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔بلدِ امین سے مراد موجودہ زمین کی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر یہاں شہر آباد ہوتے ہیں اور انسانی تہذیب ظہور میں آتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمین ایک استثنائی کرہ ہے۔ یہاں جو حالات ہیں، وہ کائنات کے کسی اور کرہ پر موجود نہیں۔مگر یہاں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ انسان اپنی ذات میں ایک معیار پسند مخلوق ہے، جب کہ موجودہ زمین دار الامتحان کے طور پر بنائی گئی ہے، اِس لیے وہ انسانی معیار کے مطابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے عملاً دار الکبد بن جاتی ہے، یعنی ایک ایسی دنیا جہاں انسان کو چین اور سکون حاصل نہیں۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک عدم مطابقت (disparity) پائی جاتی ہے۔موجودہ زمین پر انسان کی حیثیت ایک ایسے طالب کی ہے جس کا مطلوب اس کو یہاں حاصل نہیں۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان

ایک عدم مطابقت (disparity) پائی جاتی ہے۔موجودہ زمین پر انسان کی حیثیت ایک ایسے طالب کی ہے جس کا مطلوب اس کو یہاں حاصل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اِس زمین پر پیدا ہونے والے تمام عورت اور مرد بے سکونی کی زندگی گزارتے ہیں اور اِسی حال میں مرجاتے ہیں۔یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اللہم لا عیش إلا عیش الآخرۃ(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1805)یعنی انسان کو اس کی مطلوب زندگی تو صرف آخرت میں مل سکتی ہے۔

قرآن کی اِس سورہ میں اسفل سافلین کا لفظ خارجی حالات کی نسبت سے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ انسان کی اپنی داخلی نفسیات کی نسبت سے آیا ہے،یعنی ایک ایسی مخلوق جو اپنی تخلیق کے اعتبار سے، احسنِ تقویم ہے،اس کے لیے یہ دنیا عملاً اسفل سافلین کے ہم معنی بن جاتی ہے۔انسان کے لیے یہاں رہنا ایسا ہی ہے جیسے مچھلی کا پانی کے باہر رہنا۔

انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان یہ عدم مطابقت ایک سراغ (clue) ہے۔ وہ عدم مطابقت یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، جس ہیبی ٹیٹ کا طالب ہے، زمین اس کے لیے وہ ہیبی ٹیٹ نہیں۔یہ عدم مطابقت انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جس پر غور کرکے انسان ایک عظیم حقیقت کو دریافت کرسکتا ہے،یعنی یہ حقیقت کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اپنے آپ کو کامیاب بنانے کے لیے اس کو کیا کرنا چاہئے ۔

سورہ کے اگلے الفاظ اِسی بات کا جواب ہیں۔سورہ کے اگلے الفاظ یہ ہیں: اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۔یعنی جولوگ اللہ کے تخلیقی منصوبے کو دریافت کریں اور اس کے مطابق،اپنی زندگی کی تشکیل کریں تو موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا (جنت) میں داخل کیے جائیں گے، جو اُن کا مطلوب ہیبی ٹیٹ ہوگا اور اِس بنا پر وہاں عدم مطابقت کا مسئلہ باقی نہ رہے گا۔اِس دنیا میں اُن کو اپنی مطلوب زندگی مل جائے گی جس کو قرآن میں غیر ممنون اجر (unending award) کہا گیا ہے۔

اجر غیر ممنون

قرآن کی اِس آیت میں ’اجرِ غیر ممنون‘ کا لفظ ایک ذو معنی لفظ ہے، یعنی بلاغت کے

اصول کے مطابق ، اِس لفظ میں مذکور معنی کے ساتھ ایک غیر مذکور معنی بھی پوشیدہ ہے، یعنی اجرغیرممنون کے ساتھ اجرِممنون کا تصور، یا غیر منقطع اجر کے ساتھ منقطع اجر کا تصور۔

اِس آیت میں آخرت کے اجر کو غیرممنون (غیر منقطع) اجر بتایا گیا ہے۔ یہ لفظ دنیا کے اجر کے مقابلے میں آیا ہے، کیوں کہ دنیا کا اجر ممنون (منقطع) اجر ہے اور آخرت کا اجر، غیرممنون (غیرمنقطع) اجر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کا اجر عارضی اجر ہے اور آخرت کا اجر ابدی اجر۔ یہ فرق بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اجر کا ممنون (منقطع) اجر ہونا ہی وہ چیز ہے جو دنیا کو اسفل سافلین بنا دیتا ہے، کیوں کہ انسان کا معیار پسند ذہن معیار سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے صرف معیار پر مطمئن ہوسکتا ہے، معیار سے کم پر مطمئن ہونا بہ اعتبار مزاج اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کا یہی مزاج ہے جو موجودہ دنیا کو اس کے لیے دار الکبد بنا دیتا ہے۔ موجودہ دنیا مطلق معنوں میں دار الکبد نہیں ہے۔ انسان کے معیار پسندانہ ذہن کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا اس کو ایک ایسی جگہ محسوس ہونے لگتی ہے جو گویا کہ اس کے لیے دار الکبد ہو۔ اللہ نے دنیا کو دار الکبد کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے، یہ انسان کا اپنا مزاج ہے جس کی بنا پر دنیا اس کو دار الکبد نظر آتی ہے۔ یہ معاملہ انسان کی نسبت سے ہے، نہ کہ تخلیق کی نسبت سے۔

سورہ کے آخر میں فرمایا: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ -اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں جو عدم مطابقت ہے یا طالب کو اس کا مطلوب حاصل نہیں، یہ خالق کی حکیمانہ شان کے خلاف ہے۔ لازماً ایسا ہونا چاہیے کہ خالق کی حکیمانہ شان کا ظہور ہو، اِس عدم مطابقت کا خاتمہ ہو اور طالب کو اس کا مطلوب مل جائے۔ آخرت اِسی شانِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے۔

خلاصۂ کلام

سورہ التین میں جو بات رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ کے الفاظ میں کہی گئی ہے، وہی بات دوسری سورتوں میں دوسرے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ مثلاً لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ اور اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ وغیرہ۔ قرآن کے الفاظ پوری انسانی تاریخ پر منطبق ہوتے ہیں۔ اول دن سے اب تک جو

عورت یا مرد اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے، اُن سب کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا کہ آخر کار وہ محدود مدت کے بعد مر گئے اور اُن کی بنائی ہوئی دنیا بالکل اجڑ گئی۔ اِس معاملے میں کسی بھی انسان کا کوئی استثنا نہیں۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک سوالیہ نشان ہے، بلکہ سب سے بڑا سوالیہ نشان، وہ یہ کہ انسان احسنِ تقویم کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ تمام مخلوقات میں افضل مخلوق اور مکرم مخلوق ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے، معیار پسند (idealist) اور کمال پسند (perfectionist) واقع ہوا ہے۔ یہ انسانی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آگیا ہے جو اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی:

It appears that man has strayed into a world that was not made for him.

انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان یہ عدم مطابقت ہر عورت اور مرد کے لیے دعوتِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آدمی حقیقی معنوں میں حق کا متلاشی ہو تو انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کے لیے ایک ایسا سراغ (clue) بن جائے گا جس پر غور کرتے ہوئے وہ زندگی کی اصل حقیقت کو دریافت کر لے۔ اِس دریافت کے بعد اس کو معلوم ہوگا کہ موجودہ دنیا اس کے لیے صرف ایک عارضی قیام گاہ ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اِس کا مستحق بنائے کہ موت کے بعد اس کو ابدی جنت میں داخلہ ملے جو کہ انسان کا اصل ہیبی ٹیٹ ہے۔

جنت کی نرسری

کسی انسان کے لیے اِس دنیا میں سب سے پہلی جاننے کی چیز یہ ہے کہ وہ یہ دریافت کرے کہ جس ہستی نے انسان کو اور اس دنیا کو بنایا ہے، اس کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کیا ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن کے مطالعے سے جو چیز معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے ایک وسیع اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت (Paradise) ہے۔ پھر اس نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کو اس جنت میں بسایا۔

انسان کو خدا نے مکمل آزادی (freedom of choice) عطا کی۔ انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ خالق کا اعتراف کرے، وہ خود اپنے اختیار سے سلف ڈسپلنڈ (self disciplined) زندگی گزارے۔ لیکن انسان اِس امتحان میں پورا نہیں اترا۔ اُس نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس کے بعد خدا نے انسان کے بارے میں دوسرا اصول مقرر کیا۔ پہلے انسان کو عمومی بنیاد (general basis) پر جنت میں بسایا گیا تھا، لیکن جب انسان مقرر کردہ معیار پر پورا نہیں اترا تو اس کے بعد خدا نے یہ طے کیا کہ انسان کے لیے جنت کا فیصلہ انتخابی بنیاد (selective basis) پر کیا جائے، یعنی صرف اُن افراد کو جنت میں آباد کیا جائے جو سلف ڈسپلن (self discipline) کے مطلوب معیار پر پورے اتریں۔ اس مقصد کے لئے خدا نے ابدی جنت کے سوا ایک اور عارضی دنیا بنائی۔

یہ عارضی دنیا ہمارا موجودہ سیارۂ ارض (planet earth) ہے۔ سیارۂ ارض گویا ابدی جنت کو فیڈ (feed) کرنے کے لئے عارضی قسم کی ایک زندہ نرسری (living nursery) ہے۔ اس سیارۂ ارض پر انسان گویا پودے (plants) کی مانند اگائے جاتے ہیں۔ اُن کو یہاں کے مختلف حالات میں محدود مدت کے لئے زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اِس مدت میں انسان فرشتوں کے سپر وژن (supervision) میں ہوتا ہے۔ فرشتے مسلسل واچ (watch) کرتے ہیں کہ کوئی انسان مختلف حالات میں کس قسم کا رسپانس (response) دے رہا ہے اور اپنے اندر کس قسم کی پرسنالٹی کی

تشکیل کررہا ہے۔ پھر جوفرد (individual) اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مطلوب معیار کے مطابق ہے، اس کو عارضی نرسری سے نکال کر جنت کی ابدی باغ میں نصب کردیا جاتا ہے، تاکہ وہ وہاں جنت کے ماحول میں فروغ پائے اور ابدی طور پر ترقی کا سفر طے کرتا رہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ کسی فرد کو سیارۂ ارض سے ٹرانسفر کرکے ابدی جنت میں پہنچادیا جائے۔

دو دنیائیں

قرآن کی سورہ الذاریات میں تخلیق کا ایک اصول اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ** (51:49) یعنی ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فطرت کا یہ نظام ہے کہ یہاں تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی صورت میں پیدا کی گئی ہیں۔ اِسی طرح موجودہ دنیا بھی دو دنیا (pair world) کی صورت میں بنائی گئی ہے۔ سیارۂ ارض (planet earth) اس کا ایک جوڑا ہے۔ اس کا دوسرا جوڑا آخرت کی دنیا ہے، جہاں جنت (paradise) واقع ہے۔ جنت موجودہ دنیا کا تکمیلی حصہ (complementary part) ہے۔ جنت کے بغیر موجودہ دنیا نا قابلِ فہم ہے، لیکن جنت کے ساتھ وہ پوری طرح قابلِ فہم بن جاتی ہے۔

جنت کی نرسری

خالق نے ایک عظیم دنیا بنائی۔ یہ دنیا ہر لحاظ سے آئڈیل اور پرفکٹ تھی۔ اِس دنیا کا نام جنت ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت آدم کی تخلیق سے پہلے بنائی گئی (2:35)۔ اس کے بعد خالق نے چاہا کہ وہ اُن عورتوں اور مردوں کا انتخاب کرے جو اِس جنتی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ اِس مقصد کے لیے خالق نے سیارہ ارض بنایا۔ یہ سیارہ ارض گویا جنتی دنیا کی نرسری (nursery) ہے۔ نرسری اُس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں پودے اگائے جائیں اور پھر منتخب پودوں کو وہاں سے نکال کر اُن کو باغ میں نصب کیا جائے:

Nursery: A place where plants are reared for transplantation.

موجودہ زمین اِسی قسم کی ایک نرسری ہے۔ یہاں مسلسل طور پر انسان پیدا کیے جارہے ہیں۔ زمین پر وہ تمام حالات رکھے گئے ہیں جو نرسری کی حیثیت سے اس کے تقاضے پورے کرنے والے ہیں۔ ہرعورت اورمرد اپنے عمل سے اپنے اندرمثبت شخصیت یا منفی شخصیت کی تعمیر کررہے ہیں۔ موت وہ وقت ہے جب کہ ایک ''پودا'' اپنی مدت پوری کرنے پر نرسری سے اکھاڑ دیا جائے، پھر اگر وہ نامطلوب شخصیت بنا ہے تو اس کو رد کردیا جائے اور اگر اس نے اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کی ہے تو اس کو وہاں سے نکال کر جنت میں بسا دیا جائے— موجودہ دنیا اِس لیے ہے، تا کہ یہاں ایک فرد اپنے آپ کو اسپریچول شخصیت کی حیثیت سے تیار (develop) کرے اور پھر جنت میں وہ اسپریچول تہذیب کا ابدی حصہ بن جائے۔

جنت کی دنیا انسان کی اصل منزل ہے۔موجودہ عارضی دنیا نرسری (nursery) کی مانند ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے عورت اور مرد کی حیثیت گویا نرسری کے پودے کی ہے۔ اِس محدود مدت میں جو ''پودے'' صحت مندی کا ثبوت نہ دیں، ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا اور جو ''پودے'' اپنی نشو ونما کے دوران صحت مند ثابت ہوں، اُن کو باعزت طور پر موجودہ عارضی دنیا سے منتقل کرکے آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جائے گا، یعنی جنت کی دنیا میں۔اِس حقیقت کو ایک اور آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ (67:2) یعنی اللہ، جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر بے شمار عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں۔ وہ محدود مدت تک زندگی گزار کر مرجاتے ہیں، یہ ساری بھیڑ خالق کا مطلوب نہیں۔ خالق کا مطلوب صرف وہ فرد ہے جو اِس امتحانی دورِ حیات میں یہ ثابت کرے کہ وہ پورے معنوں میں احسن العمل (best in deeds) ہے۔زمین کی حیثیت نرسری کی ہے، اِس لیے یہاں ہر قسم کے پودے اگتے ہیں۔لیکن جنت کی حیثیت مطلوب منزل کی ہے، اِس لیے وہاں صرف وہی استثنائی افراد بسائے جائیں گے جن کو اُن کے ریکارڈ کی بنیاد پر منتخب کیا جائے۔

موجودہ دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ گویا نرسری کا ایک پودا ہے- ایک محدود مدت تک وہ اِس ابتدائی دنیا میں رہتا ہے- اِس دوران اُس کے ساتھ مختلف قسم کے حالات گزرتے ہیں- یہ حالات گویا اُس کے لیے تربیتی کورس (training course) ہیں- یہ حالات اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرے- موت اِس تربیتی کورس کے خاتمے کا اعلان ہے- جو انسان اِس ملی ہوئی مدت کے دوران اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرلے، اس کو نرسری سے نکال کر دوسری دنیا میں ابدی طور پر بسا دیا جاتا ہے- اور جو لوگ مطلوب انداز میں اپنی تعمیر نہ کرسکیں، اُن کو نرسری سے نکال کر باہر پھینک دیا جائے گا-

اِس دنیا کے لیے خالق کا نشانہ اجتماعی نہیں ہے، بلکہ انفرادی ہے- اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ موجودہ دنیا تعمیر نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ تعمیر شخصیت کے لیے ہے- یہاں صرف تعمیرِ شخصیت ممکن ہے، آئڈیل معنوں میں تعمیرِ نظام یہاں سرے سے ممکن ہی نہیں- انسانی زندگی کی یہی تعبیر صحیح تعبیر ہے- اِس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو ماننے کی صورت میں زندگی کے تمام سوالات کا قابلِ فہم جواب مل جاتا ہے:

With this description of human
life, everything falls into place.

ایک حدیث

تخلیق کا یہ منصوبہ قرآن وحدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے- ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے- اِس سلسلے کی دو روایتیں یہ ہیں:

1 ـ عن ابن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لقيتُ إبراهيم ليلة أسري بي- فقال يا محمد، أقرئ أمتك مني السلام، وأخبرهم أن الجنة طيبة التربة، عذبة الماء، وأنها قيعان، وأن غراسها: سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر-(سنن الترمذي، رقم الحديث: 105)

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میں میری ملاقات حضرت ابراہیم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اے محمد، اپنی امت کو میرا اسلام پہنچا دو۔ اور اُن کو بتاؤ کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ مٹی ہے، اس کا پانی بہت میٹھا ہے اور وہ ایک ہموار میدان ہے۔ اس کا پودا سبحان اللہ، و الحمدللہ، و لا إلہ إلا اللہ، و اللہ أکبر ہے۔

2۔ عن أبي أيوب الأنصاري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة أسري به مرّ على إبراهيم، فقال من معك يا جبريل، قال: هذا محمد- فقال له إبراهيم: مُر أمتك فليكثروا من غراس الجنة، فإن تربتها طيبة وأرضها واسعة- قال: وما غراس الجنة، قال: لاحول ولاقوة إلا بالله- (مسند أحمد، رقم الحديث: 7966)

حضرت ابوایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات میں حضرت ابراہیم کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے کہا کہ اے جبریل، یہ تمھارے ساتھ کون ہیں۔ جبریل نے کہا کہ یہ محمد ہیں۔ حضرت ابراہیم نے آپ سے کہا کہ اپنی امت کو بتاؤ کہ وہ جنت میں کثرت سے پودے لگائیں، کیوں کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ ہے اور اس کی زمین بہت وسیع ہے۔ آپ نے پوچھا کہ جنت کا پودا کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا کہ: لا حول و لا قوۃ إلا باللہ۔

مذکورہ روایات میں جنت کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں— قیعان اور ارضِ واسعہ۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے، یعنی وسیع اور ہموار زمین۔ یہ تمثیل کی زبان میں جنت کی اصل حقیقت کا بیان ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایک اعلیٰ مخلوق پیدا کرے اور پھر اِس مخلوق کو وہ اپنی اعلیٰ ترین نعمت سے نوازے۔ اِس منصوبے کے تحت، اللہ نے ایک معیاری دنیا بنائی۔ یہ دنیا اپنی وسعت کے اعتبار سے، اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات تھی۔ اِس میں ہر قسم کے اعلیٰ امکانات رکھے گئے تھے۔ اِس میں نہ صرف ہر قسم کی نعمتیں تھیں، بلکہ اس میں اعلیٰ ترقی کے ابدی مواقع موجود تھے۔

اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو مکمل آزادی عطا کی۔ جنت اِسی انسان کے فطری ہیبی ٹیٹ (natural habitat) کے طور پر بنائی گئی ہے۔ اِس جنت میں انسان کا داخلہ

انتخاب (selection) کی بنیاد پر مقرر کیا گیا۔ موجودہ سیارہ ارض اِس مقصد کے لیے سلیکشن گراؤنڈ یا نرسری کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو پیدا کرکے اس کو مکمل آزادی دے دی گئی ہے۔ آزادی کے اِس ماحول میں جو عورت یا مرد اپنے آپ کو جنت کی دنیا میں بسائے جانے کا مستحق ثابت کریں، اُن کو منتخب کرکے یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ جنت میں آباد ہوکر مزید ترقی کی منزلیں طے کریں۔ اِس کے برعکس، جو افراد زمینی زندگی کے امتحان میں ناکام ہوجائیں، اُن کو رد کرکے کائناتی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں تمثیل کی زبان میں بتایا گیا ہے کہ جنت کا معاملہ کیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اللہ کے سچے بندوں کے رہنے کی بہترین جگہ ہے۔ وہ ایک عالی شان رہائش گاہ ہے، مگر اپنی ابتدائی صورت میں وہ ایک غیر آباد جگہ ہے۔

اِس ابدی جنت کی آبادکاری کے لیے اللہ تعالی نے یہ انتظام کیا کہ موجود سیارہ ارض کو ایک نرسری یا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنایا۔ موجودہ زمین پر جو عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں، وہ گویا نرسری میں لگائے جانے والے پودے ہیں۔ ان پودوں میں جو پودا یہ ثابت کرے گا کہ وہ صحت مند پودا (healthy plant) ہے، اس کو دنیا کی نرسری سے نکال کر جنت کے زیادہ بہتر اور ابدی مقام پر نصب کردیا جائے گا، تاکہ وہ وہاں کے بہتر ماحول میں پرورش پاکر مزید ترقی کرے اور ابدی طور پر جنت کے شاداب باغ کا حصہ بن جائے۔

اِس حدیث میں جن کلمات (سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا إلہ إلا اللہ، واللہ أکبر، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ) کا ذکر ہے، وہ بہ اعتبار لفظ مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ باعتبارِ معنی مراد ہیں، یعنی اِن الفاظ میں جس آئڈیالوجی کا ذکر ہے، یہ الفاظ جس معرفت کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ جس طرزِ فکر (way of thinking) کو بتاتے ہیں، اُس کے مطابق، اپنی سوچ کو بنانا، اس کے مطابق، اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا، اِن کلمات کی اسپرٹ کو اپنے دل ودماغ میں اتارنا، یہاں تک کہ آدمی ربانی صفات والا انسان بن جائے۔ جو آدمی قبل ازموت دورِ حیات میں اِن کلمات کے تقاضے کے مطابق، اپنے آپ کو

ڈھالے گا، وہ بعد از موت دورِ حیات میں خدا کے اُس باغ میں بسنے کا مستحق قرار پائے گا جس کو جنت (paradise) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں جنت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن ایک اعتبار سے، جنت کا تعارف ہے۔ یہ تعارف اتنے موثر انداز میں ہے کہ اس کو پڑھنے والا آدمی گویا جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اگر آپ اِس اعتبار سے، قرآن کا تتبع کریں اور جنت کی آیتوں کو یکجا کر کے اس کا مطالعہ کریں تو آپ کے اندر شدید طور پر یہ جذبہ ابھرے گا کہ آپ جنت کو اپنی منزل بنالیں، آپ کی تمام سرگرمیوں کا رخ جنت کی طرف ہو جائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)۔

ابدی عمر، ابدی صحت، ابدی امن

قرآن اور حدیث میں جنت اور اہلِ جنت کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ابدی طور پر ہر قسم کی نعمتیں کمال درجے میں موجود ہوں گی۔ وہاں انسان کی ہر اشتہا (desire) کی تکمیل کا سامان ہوگا۔ وہاں انسان کو کامل معنوں میں فل فِل مینٹ (fulfulment) حاصل ہوگا۔ جنت میں انسان کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ مسلسل طور پر وہاں کی نعمتوں کو انجوائے کرے اور کبھی بورڈم کا شکار نہ ہو۔ جنت ہر اعتبار سے اہلِ جنت کے لیے آئڈیل اور پرفکٹ دنیا ہوگی۔

مگر اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ وجود کے ساتھ جنت کی نعمتوں سے حقیقی معنوں میں محظوظ نہیں ہوسکتا۔ اِس لیے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو وجود ملا ہے، وہ ہر اعتبار سے، ایک محدود وجود ہے — اِس وجود پر بڑھاپا آتا ہے، یہ وجود بیماری اور حادثات سے دوچار ہوتا ہے، یہ وجود زوال (de-generation) کا شکار ہوتا ہے، اِس وجود پر موت طاری ہوتی ہے، اِس وجود کے آرگن (organs) کمزور وناکارہ ہوتے رہتے ہیں، اِس وجود پر نیند اور تھکاوٹ طاری ہوتی ہے، اِس وجود کے حواس (senses) معطل ہوتے رہتے ہیں، وغیرہ۔

ایسی حالت میں انسان کو اگر جنت اِس طرح ملے کہ جنت میں ہر قسم کا سامانِ عیش تو کامل طور پر موجود ہو، لیکن انسان کا وجود یہی موجودہ دنیا والا وجود ہو، جو کہ ہر قسم کی کمزوریوں (weaknesses) کا شکار ہوتا ہے، اس کو ہر قسم کی محدودیت (limitations) لاحق ہوتی ہے، اس کو بدستور جسمانی زوال (physical degeneration) پیش آتا رہے، جیسا کہ وہ اِس دنیا میں پیش آتا تھا۔ اگر ایسا ہو تو انسان کے لیے جنت اینٹ پتھر کا ایک ڈھیر بن جائے گی، وہ اس کے لیے لذت اور خوشی کی جگہ ثابت نہ ہوگی۔ جنت انسان کے لیے صرف اُس وقت جنت ہے جب کہ وہ خود جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

اگر انسان کے اپنے اندر جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت نہ ہو تو جنت اس کے لیے بلا شبہہ ایک مصیبت خانہ ہوگی، نہ کہ کوئی عیش خانہ۔ جنت اسی طرح اس کے لیے ایک دارالکبد ہوگی، جیسا کہ موجودہ دنیا اس کے لیے دارالکبد تھی۔ اِس کا تقاضا ہے کہ اہلِ جنت کو آخرت میں جنت کے ساتھ ایک نیا وجود بھی عطا کیا جائے، ایسا وجود جو ابدی عمر رکھتا ہو، اس کو ایسی صحت ملے جو بھرپور صحت (health in full swing) کی حامل ہو۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص موجودہ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (spiritually purified personality) کی حیثیت سے ڈیولپ (develop) کرے، اس کو آخرت میں اللہ کے خصوصی عطیہ کے طور پر جسمانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (physically purified personality) حاصل ہوگی۔ ایسی شخصیت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتبار سے، کامل صفات کی حامل ہوگی۔ وہ اِس قابل ہوگی کہ جنت کی نعمتوں سے بھرپور طور پر خط (enjoyment) حاصل کرے، وہ کسی بھی پہلو سے محدودیت (limitation) اور ڈس ایڈوانٹج (disadvantage) میں مبتلا نہ ہو، وہ ابدی طور پر کامل فل فل مینٹ (fulfilment) کے احساس میں جیتا رہے۔

چناں چہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنتی انسان ہمیشہ جوانی کی عمر (youth age) میں رہیں گے،

جیسے کہ وہ صرف 30 سال کی عمر کے ہوں۔ وہ ہر اُس جسمانی کمزوری (physical weakeness) سے مکمل طور پر پاک ہوں گے جو دنیا کی زندگی میں اُن کے جسم کا لازمی حصہ تھی۔

اِسی طرح جنت کے باشندے ہر قسم کی جسمانی کمی سے پاک ہوں گے۔ مثلاً وہ کبھی بیمار نہیں ہوں گے۔ اُن کو بول و براز کی حاجت نہ ہوگی۔ اہلِ جنت کو جو جسم ملے گا، وہ ایسا جسم ہوگا جو ابدی طور پر شباب کی حالت میں رہے گا۔ اس پر نیند اور تھکاوٹ اور بڑھاپا طاری نہیں ہوگا۔ جنت میں اہلِ جنت کو خطاب کرکے یہ اعلان کیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ صحت مند رہوگے، کبھی بیمار نہ ہوگے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہوں گے، کبھی تم پر موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہوگے، کبھی تم بوڑھے نہ ہوگے۔ اب تم ہمیشہ خوش حال رہوگے، کبھی تنگی میں مبتلا نہ ہوگے، وغیرہ۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مشکاۃ المصابیح: جلد 3، کتاب أحوال القیامۃ وبدء الخلق، باب صفۃ الجنۃ وأھلھا)

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور انسان دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جنت مکمل طور پر انسان کے مطابقِ حال ہے اور انسان مکمل طور پر جنت کے مطابقِ حال۔ جنت انسان کا ہیبی ٹیٹ (habitat) ہے اور انسان جنت کا مطلوب باشندہ (citizen)۔ انسان کے بغیر جنت کا وجود ادھورا ہے اور جنت کے بغیر انسان کا وجود ادھورا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے طالب اور مطلوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنت کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی ہے اور انسان کے بغیر جنت کے وجود کی کوئی معنویت نہیں۔ یہ طالب اور مطلوب دونوں آخرت میں اکھٹا کیے جائیں گے اور اس کے بعد ابدی طور پر ایک دورِ کمال شروع ہوگا، جس کی خوشیاں کبھی ختم نہ ہوں گی، اور نہ اس کی رونق پر کبھی زوال آئے گا۔ یہ جنت انسان کا انتظار کررہی ہے، لیکن اِس جنت میں داخلہ صرف اُس انسان کو ملے گا جو اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرے۔

کلماتِ ذکر کی حقیقت

مذکورہ روایات میں پانچ کلمات کا ذکر ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں— سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا إلہ إلا اللہ، واللہ أکبر، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ۔ اِن کلمات کے جو الفاظ ہیں، وہ محض الفاظ

نہیں ہیں، بلکہ وہ گہرے معانی کو بتا رہے ہیں اور یہ الفاظ اپنے اِنھیں گہرے معانی کے اعتبار سے مطلوب ہیں، نہ کہ محض الفاظ کے اعتبار سے، یعنی اُن کا فائدہ محض اُن کی لفظی تکرار میں نہیں ہے، بلکہ ان کی اسپرٹ یا ان کی معنویت کو اپنانے میں ہے۔

لا حول و لا قوۃ کیا ہے۔ وہ اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تمام طاقتوں کا مالک (all-powerful) ہے۔ 'سبحان اللہ' کیا ہے سبحان اللہ اِس حقیقت کی دریافت ہے کہ خدا ہر قسم کے عیب اور نقص سے کامل طور پر پاک ہے۔ الحمد للہ کیا ہے۔ الحمد للہ دراصل یہ ہے کہ ایک صاحبِ معرفت آدمی اللہ کے کمالات کو دریافت کرکے اس کا شعوری اعتراف کرے۔ لا إلہ إلا اللہ کیا ہے۔ لا إلہ إلا اللہ دراصل تمام معبودوں کو رد کرکے اللہ کو معبودِ حقیقی کے طور پر دریافت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اللہ أکبر کیا ہے۔ یہ وہ عارفانہ کلمہ ہے جو ایک شخص کی زبان سے اُس وقت بے تابانہ طور پر نکل پڑتا ہے، جب کہ وہ تدبر کے نتیجے میں اللہ کے مقامِ عظمت کو دریافت کرے۔

یہ کلمات دراصل ذکرِ الٰہی کے کلمات ہیں۔ ذکر کی حقیقت معرفت ہے اور معرفتِ الٰہی بلاشبہہ سب سے بڑی نیکی (virtue) ہے۔ لیکن معرفت کوئی سادہ چیز نہیں۔ معرفت سے پہلے دریافت ہے۔ دریافت سے پہلے تدبر ہے، تدبر سے پہلے یکسوئی (concentration) ہے، یکسوئی سے پہلے سنجیدگی ہے۔ آدمی سب سے پہلے سنجیدگی کا ثبوت دیتا ہے، پھر وہ اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے یکسو کرتا ہے، اس کے بعد وہ غور وفکر کرتا ہے، جس کو تدبر کہا جاتا ہے۔ تدبر اس کو دریافت تک پہنچاتا ہے اور دریافت معرفت تک۔ سنجیدہ تفکر کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب کسی انسان کو اللہ رب العالمین کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک فکری بھونچال آتا ہے، اس کے اندر حقیقت شناسی کا ایک سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔ یہ ربانی کیفیت جب ایک انسان کی زبان سے بے تابانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے تو اسی کا نام ذکر الٰہی ہے۔

یہ کلمات دراصل اُس شعوری عمل (intellectual process) کو بتاتے ہیں جو ایک صاحبِ ایمان کے اندر موجودہ دنیا میں جاری ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے

ایک صاحبِ ایمان پر مختلف احوال اور تجربات گزرتے ہیں۔ اگر اس کے اندر ایمانی شعور زندہ ہو تو یہ تمام احوال وتجربات اس کے لیے رزقِ رب کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ آخرکار وہ اُس مطلوب انسان کا درجہ حاصل کر لے گا جو آخرت کی جنت میں داخلے کے لیے ایک مستحق امیدوار (deserving candidate) کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کا موضوع

قرآن خالقِ کائنات کی کتاب ہے۔ قرآن کا موضوع (subject) یہ ہے کہ انسان کے بارے میں اللہ کے تخلیقی منصوبہ سے اس کو آگاہ کیا جائے۔ قرآن کے تمام بیانات براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِسی معاملے کی وضاحت ہیں۔ مثلاً قرآن کی سورہ ابراہیم میں بتایا گیا ہے کہ انسان دوقسم کے ہوتے ہیں — ایک انسان وہ ہے جو اپنی زندگی کی تعمیر 'کلمۂ طیبہ' (14:24) کی بنیاد پر کرے اور دوسرا انسان وہ ہے جو 'کلمہ خبیثہ' (14:26) کی بنیاد پر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو انسان اپنی زندگی کی تعمیر 'کلمۂ طیبہ' کی بنیاد پر کرے، وہ موجودہ دنیا میں بھی اپنا رزق پائے گا اور موت کے بعد کی زندگی میں اس کو اعلیٰ مقامات حاصل ہوں گے۔ اِس کے برعکس، جو آدمی 'کلمۂ خبیثہ' کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائے، اس کو استحکام حاصل نہیں ہوگا، اس کو غیر صحت مند پودے کی طرح اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا، وہ جنت میں داخلے کے لیے نااہل قرار پائے گا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ انسانوں کی بڑی اکثریت نے اِس تخلیقی حکمت کو نظر انداز کیا، انھوں نے اپنے آپ کو آخرت کے اعتبار سے نہیں بنایا، وہ موجودہ دنیا کی ظاہری چیزوں میں پھنس کر رہ گئے۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن ھؤلاء یحبون العاجلة ویذرون وراءھم یوما ثقیلا (76:27)۔

تاریخ کا تجربہ

تاریخ کے ہر دور میں تمام سوچنے والے انسان ایک ہی آبسیشن (obsession) میں مبتلا رہے ہیں — موجودہ دنیا کو کس طرح بہتر دنیا بنایا جائے۔ ہر دور کے انسانوں کا یہ ایک مشترک خواب

رہا ہے۔ مذہبی لوگ اپنے اِس خواب کے لیے صالح نظام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور سیکولر لوگ اس کو آئڈیل سسٹم کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، خواہ وہ فکشن ہو یا نان فکشن، تقریباً ان سب کا خلاصہ یہی ہے۔ کوئی کتاب براہِ راست طور پر اِس موضوع پر لکھی گئی ہے اور کوئی کتاب بالواسطہ طور پر اِس موضوع سے متعلق ہے۔

یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ تاریخ کی تمام سرگرمیوں کا نشانہ (goal) عملاً یہی ایک تھا۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اِس سلسلے کی تمام انسانی سرگرمیاں نتیجے کے اعتبار سے، ناکام ہوکر رہ گئیں، کوئی بھی کوشش اپنے مطلوب نشانے تک نہیں پہنچی، نہ سیکولر لوگ اپنا مفروضہ آئڈیل سسٹم بنا سکے اور نہ مذہبی لوگ اپنا مذکورہ صالح نظام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سوال ہے۔ اِس سوال کا جواب معلوم کرنا خود انسان کے وجود کی معنویت کو معلوم کرنا ہے اور بلاشبہہ اِس سے بڑی کوئی دریافت (discovery) نہیں ہوسکتی کہ انسانی وجود کی معنویت کو حقیقی طور پر دریافت کیا جائے۔ سیکولر مفکرین اور مذہبی مصلحین کی اِس عمومی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ان کا منصوبہ خالق کے منصوبہ تخلیق سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور جو منصوبہ خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق نہ ہو، اس کے لیے اِس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔ خالق کے منصوبے کے مطابق، یہ دنیا ایک جوڑا دنیا (pair world) کی صورت میں بنائی گئی ہے۔ ایک دنیا دوسری دنیا کا تکملہ (complement) ہے۔ اِس تخلیقی منصوبے کے مطابق، کرۂ ارض (planet earth) کی حیثیت ایک وقتی نرسری (nursery) کی ہے، اور دوسری دنیا کی حیثیت ایک ابدی باغ (eternal garden) کی، جس کو معروف طور پر جنت (paradise) کہا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں جنت کی تخلیق کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (3:133) یعنی جنت اہلِ تقویٰ کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (32:17) یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ اُن کے لیے اُن کے اعمال کے صلے میں

آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے، وغیرہ۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اپنے منصوبے کے مطابق، پہلے جنت کی دنیا بنائی۔ اس کے بعد اہلِ جنت کا انتخاب کرنے کے لیے موجودہ سیارۂ ارض کو بنایا، جو کہ دراصل جنت کی ابدی دنیا کے لیے ایک عارضی نرسری کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس عارضی نرسری میں عورت اور مرد محدود مدت کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ منصوبہ تخلیق کے مطابق، جب انسانوں کی تعداد پوری ہوجائے گی، اُس وقت سیارہ ارض پر قیامت کا زلزلہ آئے گا اور اس کی موجودہ حیثیت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

انسان کو موجودہ دنیا میں بسنے کے لیے صرف محدود وقت ملتا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کی عمر کا اوسط تقریباً 70 سال ہے۔ اِس مدت میں جو افراد اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں، اُن کو موت کے بعد لے جا کر جنت کی دنیا میں آباد کردیا جاتا ہے اور جو عورت یا مرد اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں، اُن کو ''خبیث پودے'' کی مانند اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ زمین کی صورت میں جو نرسری بنائی گئی ہے، وہ صرف عارضی مدت کے لیے ہے، اور جنت کی صورت میں جو معیاری دنیا بنائی گئی ہے، وہ ابدی ہے، وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

تہذیب کے دو دھارے

تہذیب (civilization) کے لفظ سے عام طور پر صرف ایک چیز مراد لی جاتی ہے اور وہ مادی تہذیب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کے دو دھارے ہیں جو مسلسل طور پر تاریخ میں جاری رہے ہیں۔ پہلے دھارے کو مادی تہذیب (material civilization) کہا جاتا ہے۔ دوسرے دھارے کو روحانی تہذیب (spiritual civilization) کہہ سکتے ہیں۔ روحانی تہذیب سے مراد کوئی مبہم چیز نہیں۔ اِس سے مراد عین وہی چیز ہے جو پیغمبروں کی ہدایت کے ذریعے تاریخ میں قائم ہوئی۔ روحانی تہذیب کا لفظ ہم نے صرف اِس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے قریب الفہم ہے۔

مادی تہذیب کا دھارا ایک دکھائی دینے والا دھارا (visible stream) ہے، اِس لیے ہر آدمی اس سے واقف ہے۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا دھارا ایک نہ دکھائی دینے والا دھارا (invisible stream) ہے، اِس لیے اُس کو صرف گہرے غور وفکر کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ فرق ایسا ہی ہے جیسے ایک انسان کے وجود میں دو چیزوں کا فرق۔ انسانی وجود کا ایک پہلو اس کا مادی جسم ہے جو پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے وجود کا دوسرا حصہ روح (soul) ہے جو کہ پوری طرح موجود ہوتی ہے، لیکن بظاہر وہ دکھائی نہیں دیتی۔

مادی تہذیب، مادی امکانیات کو انفولڈ کرکے وجود میں آتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مادی تہذیب اب سے تقریباً 6 ہزار سال پہلے میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کے علاقے میں ابتدائی طور پر شروع ہوئی، پھر وہ ترقی کرتے کرتے موجودہ تکمیلی دور تک پہنچی۔

یہی معاملہ روحانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کا ہے۔ روحانی تہذیب بھی کچھ امکانیات کو انفولڈ کرکے وجود میں آتی ہے، لیکن دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ مادی تہذیب کا واقعہ اجتماع یا سوسائٹی کی سطح پر وجود میں آتا۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا

واقعہ ایک انفرادی واقعہ ہے اور وہ فرد کی سطح پر وجود میں آتا ہے۔فرد کے اندر ذہنی بے داری، فرد کے اندر مقصدِ اعلی کا شعور، فرد کے اندر خدا کے لیے حب شدید اور خوفِ شدید، فرد کے اندر جنت کا اشتیاق، وغیرہ۔

روحانی تہذیب فرد کے اندر مذکورہ قسم کے غیر مرئی (invisible) فکری انقلاب سے شروع ہوتی ہے، پھر وہ ترقی کرکے ربانی شخصیت تک پہنچتی ہے۔اِس طرح کے افراد ہر دور اور ہر زمانے میں برابر پیدا ہوتے ہیں۔اِن افراد کی سطح پر روحانی تہذیب کا غیر مرئی دھارا نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ مادی تہذیب اگر اجتماعی اداروں (social organisations) کی سطح پر چلتی ہے تو روحانی تہذیب افراد کی داخلی کیفیات اور افکار کی سطح پر جاری رہتی ہے۔

قرآن کا حوالہ

قرآن تاریخ تہذیب کی کتاب نہیں، لیکن قرآن میں دونوں قسم کی تہذیبوں کے بارے میں اشاراتی حوالے موجود ہیں۔قرآن کی آیتوں میں تدبر کرکے ان کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مادی تہذیب کی بات ہے، اس کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ الروم میں اِن الفاظ میں آیا ہے: أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (30:9) یعنی کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے۔وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔اور انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو اُس سے زیادہ آباد کیا جتنا انھوں نے آباد کیا ہے۔ اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک خصوصی واقعے کے حوالے سے ایک عمومی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اِس قانون کا اشاراتی ذکر آیت کے اِن الفاظ میں ہے: وعمروھا أکثر مما عمروھا۔

عمومی انطباق کے اعتبار سے، اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر دور میں اپنی بڑھی ہوئی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی زندگی کی مادی تعمیر کرتا رہا ہے۔اِن سرگرمیوں کے ذریعے ارتقائی طور پر جو محسوس واقعہ ظہور میں آیا، اُسی کا نام مادی تہذیب ہے۔اِس کے مقابلے میں سرگرمیوں کا دوسرا کلچر جو فرد کی سطح پر جاری رہا، وہی وہ واقعہ ہے جس کو ہم نے روحانی تہذیب کا نام دیا ہے۔جس طرح مادی تہذیب کا تسلسل تاریخ میں برابر جاری رہا اور جس کا اشارہ قرآن کی مذکورہ آیت میں موجود ہے، اِسی طرح روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل بھی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔روحانی تہذیب کے تسلسل کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ المومنون کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (23:44) یعنی پھر ہم نے لگا تار اپنے رسول بھیجے:

We sent Our messengers in succession.

خدا کے پیغمبر ہر دور میں مسلسل آتے رہے اور ان کی تعلیم و تلقین کے ذریعے تاریخ میں روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل قائم رہا۔مادی تہذیب کا تسلسل اگر اجتماعی سطح پر دکھائی دینے والے مظاہر کی صورت میں قائم رہا تو روحانی تہذیب کا تسلسل افراد کے اندر غیر مرئی احوال کی صورت میں جاری رہا۔

برطانی مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے 21 بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جن کی مدت تقریباً 5 ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔اِس مطالعے کے نتائج کو اس نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے جو 12 جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔اس کا نام یہ ہے:

Arnold Toynbee, *The Study of History*

مادی تہذیب کے بارے میں اِس طرح کی کتابیں اور اِس طرح کے مقالات بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، مادی تہذیب کے تاریخی آثار (monuments) زمین کے مختلف حصوں میں موجود ہیں جو سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہیں۔ مادی تہذیب کو پروجیکٹ کرنے کے لیے بڑے بڑے میوزیم بنائے گئے ہیں۔بڑے بڑے ادارے، بڑی بڑی تنظیمیں اور بڑے بڑے شہر گویا اُن کے تعارفی مراکز ہیں۔ اِن مراکز کو دیکھ کر لوگ کہہ پڑتے ہیں — ونڈرفل، ونڈرفل (wonderful, wonderful)۔

اِسی طرح روحانی تہذیب کے واقعات بھی متوازی طور پر موجود ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مادی تہذیب سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ یہ واقعات پوری تاریخ میں مسلسل طور پر پیش آتے رہے ہیں، لیکن اِن واقعات کے محسوس مظاہر کہیں موجود نہیں، اِس لیے لوگ اُن سے واقف نہیں۔ روحانی تہذیب کے واقعات ہمیشہ افراد کی سطح پر ان کی داخلی دنیا میں غیر مرئی طور پر پیش آتے ہیں۔ یہ افراد اگرچہ انسانی تاریخ کے اعلی ترین افراد ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی طبیعی عمر پوری کرکے اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ روحانی تہذیب کو نہ ان کی زندگی میں لوگ دیکھ پاتے اور نہ ان کی وفات کے بعد۔

اسپریچول تہذیب کے اجزا

مصر کے بادشاہوں نے 2700-2300 قبل مسیح کے درمیان مصر میں بڑی بڑی سنگی عمارتیں بنائیں جو اہرام (pyramids) کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے بادشاہ شاہ جہاں نے 48-1630 عیسوی کے درمیان آگرہ (یوپی) میں تاج محل بنوایا۔ اِس طرح کی ہزاروں عمارتیں ہیں جو مادی تہذیب کے تاریخی مظاہر کے طور پر دنیا کے مختلف ملکوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسپریچول تہذیب کے تحت جو واقعات ظہور میں آئے، اُن کا ریکارڈ کہاں ہے۔ کیا وہ اِسی لیے تھے کہ وقتی ظہور کے بعد وہ معدوم ہوجائیں اور ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں۔ یہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا سوال ہے۔

مثال کے طور پر آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک معاملے پر نزاع ہوئی۔ قابیل سخت غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں تم کو مارڈالوں گا۔ اِس کے جواب میں ہابیل نے کہا: لَئِنۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (5:28) یعنی اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔

چناں چہ ہابیل قتل ہوگیا، مگر اس نے اپنے بڑے بھائی قابیل پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اُس وقت

ہابیل کے سینے میں خوفِ خدا کا جو طوفان آیا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی عمارتوں سے بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ فرشتوں نے یقیناً اس کو ریکارڈ کیا، لیکن انسان کی آنکھوں نے کبھی اِس واقعے کو نہیں دیکھا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ صرف اس لیے تھا کہ وہ ایک شخص کے دل میں پیدا ہو اور ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔

اِسی طرح چار ہزار سال پہلے جب پیغمبر ابراہیم نے ایک خدائی منصوبے کے تحت اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ اُس وقت ہاجرہ نے پیغمبر ابرہیم سے پوچھا کہ کیا خدا نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس کے بعد ہاجرہ کی زبان سے نکلا: إذن لا یضیّعنا (پھر اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا)۔ صحرا کے اِس بے آب وگیاہ ماحول میں جب ہاجرہ نے یہ الفاظ کہے ہوں گے، اُس وقت ان کے دل میں اعتماد علی اللہ کا ایک عظیم کیفیاتی طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ طوفان بلاشبہ مصر کے اہرام اور آگرہ کے تاج محل سے بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ فرشتوں کے ریکارڈ میں آیا، لیکن انسان کے لیے وہ ایک ناقابلِ ذکر واقعہ بنا رہا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ اِسی لیے پیش آیا کہ وہ ایک فرد کے دل میں برپا ہو، اِس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔

اِسی طرح ایک واقعہ وہ ہے جو تقریباً تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانے میں پیش آیا۔ قرآن میں اِس واقعے کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ اُس وقت کے بادشاہ فرعون نے مصر کے ماہر جادوگروں کو بلایا، تاکہ وہ حضرت موسیٰ کے معجزے کا مقابلہ کریں۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق، ایک میدان میں اہلِ مصر بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ وہاں جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں۔ لوگوں کو نظر آیا کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر میدان میں چل رہی ہیں۔ اُس وقت حضرت موسیٰ نے اپنا عصا میدان میں ڈالا۔ حضرت موسیٰ کا عصا اژدہا بن کر جادوگروں کے سحر کو نگل گیا۔

جادوگروں نے جب اِس واقعے کو دیکھا تو اُن پر ظاہر ہوگیا کہ اُن کا کیس جادو کا کیس تھا، لیکن موسیٰ کا کیس اِس سے مختلف ہے، موسیٰ کا کیس رب العالمین کے پیغمبر کا کیس ہے۔ اِس صداقت کے ظاہر ہوتے ہی جادوگروں نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ وہ پکار اٹھے: آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ (20:70)۔

فرعون جادوگروں پر سخت غضبناک ہوا۔ اس نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، لیکن جادوگر اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (20:72) یعنی جادوگروں نے کہا کہ ہم تجھ کو ہرگز اُن دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اُس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ پس تم کو جو کچھ کرنا ہے، اُسے کرڈالو۔ تم جو کچھ کرسکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کرسکتے ہو۔

مصر کے جادوگروں نے یہ جملہ موت کی قیمت پر کہا تھا۔ اُس وقت اُن کے دل میں سچائی کا جو طوفان برپا ہوا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے شمار گنا زیادہ عظیم ہے۔ کیا سچائی کا یہ طوفان صرف اِس لیے تھا کہ وہ کچھ انسانوں کے سینے میں وقتی طور پر برپا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کا وجود مٹ جائے۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح البخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں بنی اسرائیل کے تین صالح افراد ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ درمیان میں بارش آگئی۔ چناں چہ انھوں نے پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لی۔ اُس وقت وہاں لینڈ سلائڈ (landslide) کا ایک واقعہ ہوا۔ اس کی وجہ سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ یہ پتھر اتنا بڑا تھا کہ تینوں آدمی مل کر بھی اس کو ہٹا نہیں سکتے تھے۔ اُس وقت انھوں نے طے کیا کہ ہر ایک اپنے کسی خاص عمل کے واسطے سے دعا کرے۔ چناں چہ انھوں نے دعا کی اور پتھر ہٹ گیا، پھر وہ لوگ غار سے باہر نکل آئے۔

اِن تینوں میں سے ایک شخص وہ تھا جس نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ، میں مزدوروں سے کام لیا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مزدور کسی بات پر غصہ ہوگیا۔ وہ اپنی مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ اِس کے بعد میں نے اس کی مزدوری کی رقم سے ایک گائے خریدی۔ اِس گائے میں اتنی برکت ہوئی کہ ڈھیرے ڈھیرے گائے اور بکری اور اونٹ کا ایک بہت بڑا گلّہ اکھٹا ہوگیا۔ ایک عرصے کے بعد وہ مزدور دوبارہ آیا اور اپنی مزدوری کا تقاضا کیا۔ اُس وقت میرے گھر کے سامنے کا میدان جانوروں کے گلے سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ سب تمھارا ہے، اِس کو لے جاؤ۔ مزدور نے کہا کہ مجھ سے استہزا نہ کرو۔ میں نے کہا کہ یہ استہزا کی بات نہیں، یہ سب تمھاری مزدوری کی رقم کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد وہ مزدور اُن تمام جانوروں کو ہنکا کر لے گیا اور ایک بھی نہ چھوڑا۔ میں نے مزدور کو نہیں روکا اور اُس پر راضی رہا۔ (صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، حديث الغار، رقم: 3465)

اُس آدمی نے جب یہ فیصلہ کیا تو اُس وقت اس کے سینے میں دیانت داری (honesty) کا ایک عظیم طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے حساب گنا زیادہ بڑا تھا۔ کیا یہ واقعہ محض اِس لیے ہوا کہ وہ صرف ایک شخص کے سینے میں برپا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔ اِس طرح کے واقعات جو افراد کی زندگی میں داخلی طور پر پیش آئے، ایسے کسی واقعے کو اُس فرد نے تو یقیناً جانا جس کو اس کا تجربہ پیش آیا تھا، لیکن اس کی اپنی ہستی کے باہر اُس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیا، وہ صرف غیر مرئی قسم کا ایک ذاتی احساس بن کر رہ گیا۔ ہر عورت اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر چاہتے ہیں کہ اُن کے داخلی احساسات خارجی واقعہ بن کر نمایاں ہوں۔ جو کچھ انھوں نے وقتی طور پر محسوس کیا تھا، وہ اُسی طرح تاریخ کا مستقل حصہ بن جائے جس طرح دوسری بہت سی چیزیں تاریخ کا مستقل حصہ بنی ہوئی ہیں۔

یہ ایک سوال ہے اور قرآن کے مطالعے سے اِس کا واضح جواب معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مادی تہذیب ہے جو قیامت کے دن معدوم ہوجائے گی اور جہاں تک روحانی تہذیب کا سوال ہے، وہ اپنی پوری صورت میں ظاہر ہو کر ابدی طور پر اپنا جلوہ دکھاتی رہے گی۔

دو مختلف انجام

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی تہذیب کی ترقیاں صرف وقتی ترقیاں ہیں۔ قیامت کا بھونچال مادی تہذیب اور اس کے تمام آثار کو یکسر مٹا دے گا۔ قیامت کے بعد بننے والی دنیا میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ۚ وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ اَمَلًا (18:46) یعنی مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ

تمھارے رب کے نزدیک اجر اور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'زینۃ الحیاۃ الدنیا' سے مراد وہی چیز ہے جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ مادی تہذیب خواہ بظاہر کتنا ہی زیادہ پُررونق ہو، بہر حال وہ وقتی طور پر صرف امتحان کی مدت تک کے لیے ہے۔ قیامت کا بھونچال اس کو پوری طرح مٹادے گا۔ اِس کے بعد زمین کا وہ حال ہوگا جس کو قرآن میں **قاعاً صفصفاً** (20:106) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی چٹیل میدان۔

'باقیات الصالحات' کا لفظی ترجمہ ہے: باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ۔ صالح عمل حقیقۃً وہ ہے جو صالح نیت سے کیا گیا ہو۔ 'باقیات الصالحات' دوسرے لفظوں میں کسی عمل کے کیفیاتی حصہ (qualitative content) کا نام ہے۔ عمل کا یہ کیفیاتی حصہ کہاں واقع ہوتا ہے، وہ ایک مرد یا عورت کے داخلی وجود میں واقع ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے قابلِ فہم بنانے کے لیے روحانی تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قیامت کا بھونچال یہ کرے گا کہ انسانی عمل کے کمیاتی حصہ (quantitative content) کو ڈھادے گا۔ اِس کے بعد انسانی عمل کا صرف کیفیاتی حصہ (qualitative content) باقی رہے گا۔

قرآن میں اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ** (10:26)۔ اِس آیت میں ''زیادہ'' کا لفظ غالباً اِس معنی میں ہے کہ آخرت میں اہلِ جنت کے ساتھ جو معاملہ ہوگا، وہ صرف یہ نہیں ہوگا کہ ان کے نیک عمل کو قبولیت کا درجہ ملے گا، بلکہ مزید یہ ہوگا کہ عمل کے دوران اُن کے اندر جو اعلیٰ ربانی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، وہ خارجی طور پر متشکل ہوجائیں گی۔ یہی خارجی اظہار وہ چیز ہے جس کو ہم نے اسپریچول تہذیب کا نام دیا ہے۔

مادی تہذیب مادی واقعات کے متشکل ہونے سے وجود میں آتی ہے۔ اِس کے برعکس، اسپریچول تہذیب وہ تہذیب ہے جہاں اعلیٰ ربانی کیفیات متشکل ہوں۔ موجودہ دنیا جن قوانین کے تحت بنی ہے، وہاں کمیاتی عمل (quantitative deeds) تو بخوبی طور پر متشکل ہوسکتے ہیں، لیکن کیفیاتی عمل (qualitative deeds) یہاں متشکل نہیں ہوسکتے۔ آخرت کی دنیا کے قوانین

بالکل مختلف ہوں گے۔ اِس طرح وہاں یہ ممکن ہوجائے گا کہ ایک کیفیاتی واقعہ بھی اُسی طرح عملی صورت میں متشکل ہوجائے جس طرح موجودہ دنیا میں کمیاتی واقعہ عملی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مزید مطالعہ کیجئے۔ اِن آیتوں کے الفاظ اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (11:15-16) یعنی جولوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا اور باطل ہوگیا جو کچھ انھوں نے کمایا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں زینتِ دنیا سے مراد تاریخِ انسانی کا وہی ظاہرہ ہے جس کو ہم نے مادی تہذیب کے معروف نام سے بیان کیا ہے۔ اِس مادی تہذیب کی عمر صرف قیامت تک کے لیے ہے۔ اِس کے بعد وہ مٹا دی جائے گی۔ اس کا انجام وہی ہوگا جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں 'حبط ما صنعوا' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا (vain are all their deeds)۔

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ گویا کہ اِسی موجودہ دنیا میں اپنے لیے ایک دنیا بنانا ہے۔ یہ بلاشبہہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف ہے۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا عمل کے لیے بنائی گئی ہے، نہ کہ تعمیر جنت کے لیے۔

ایسا کرنے والے لوگ خدا کے منصوبے کے خلاف چل رہے ہیں۔ اُن کی ساری سرگرمیاں خدا کے نزدیک غیر مقبول ہیں، اِس لیے اُن کا وجود صرف اُس وقت تک ہے جب تک اُن کی امتحان کی مدت ختم نہیں ہوتی۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اُن کی بنائی ہوئی یہ مادی دنیا اُسی طرح ختم کردی جائے گی جس طرح غیر منظور شدہ تعمیر

(unauthorised construction) کو سرکاری طور پر ڈھادیا جاتا ہے۔

اسپریچول تہذیب کا دور

قیامت دو دنیاؤں کے درمیان حدفاصل ہے۔ قیامت کا مطلب یہ ہے کہ مادی تہذیب کا دور ختم ہوا اور روحانی تہذیب کا دور شروع ہو گیا۔ اِسی دوسرے دور کو قرآن میں آخرت کا دور کہا گیا ہے۔ اِس دوسرے دور میں یہ ہوگا کہ پوری تاریخ میں بکھرے ہوئے روحانی اجزا (spiritual contents) کو جنت میں یکجا کردیا جائے، یعنی اسپریچول اجزا کے حامل انسانوں کو بقیہ انسانوں سے الگ کرکے جنت کی معیاری دنیا میں بسا دینا۔ اِسی حقیقت کو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ (21:105)۔

اِس واقعے کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں — پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمینوں کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے:

> But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land and dwell in it forever. (Psalm 37:28-29)

اسپریچول تہذیب یا ربانی تہذیب قیامت سے پہلے کی دنیا میں صالح افراد کی سطح پر ظہور میں آئے گی۔ قیامت کے بعد یہ تمام صالح افراد پوری تاریخِ بشری سے منتخب کرکے جنت میں بسادیے جائیں گے۔ اِس دوسرے دورِ حیات میں ان کی داخلی اسپریچولٹی یا داخلی ربانیت خارجی واقعہ بن کر چمک اٹھے گی۔ جو چیز دنیا کی زندگی میں داخلی کیفیت (inner spirit) ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ آخرت کے بدلے ہوئے ماحول میں خارجی طور پر دکھائی دینے والا واقعہ بن جائے گا۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں نور کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ صالح افراد کی ربانیت جو موجودہ دنیا میں ایک چھپی ہوئی حقیقت بنی ہوئی تھی، وہ آخرت کی دنیا میں ایک دکھائی دینے والی حقیقت بن جائے گی۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مطالعہ کیجیے۔

پہلی آیت قرآن کی سورہ الحدید میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ

وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (57:12) یعنی جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی اُن کے آگے اور ان کے دائیں چل رہی ہوگی— آج کے دن تم کو خوش خبری ہے اُن باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، تم اُن میں ہمیشہ رہو گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

اِسی طرح سورہ الحدید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (57:19) یعنی جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

اِسی قسم کی ایک آیت قرآن کی سورہ التحریم میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (66:8) یعنی اے ایمان والو، اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے گناہ معاف کردے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس دن اللہ، نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ اُن کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہوگی، وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں میں نور (روشنی) کے دوڑنے کا ذکر لفظی طور پر دوڑنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ پھیلنے کے معنی میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا نور دور دور تک پھیلا ہوا ہوگا۔ مزید یہ کہ نور کا لفظ سادہ طور پر روشنی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اِس معنی میں ہے کہ

ان کے عمل کا روحانی حصہ (spiritual content) جو دنیا میں اعلی داخلی تجربے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ آخرت میں متشکل (materialised) ہوکر خارجی طور پر دکھائی دینے لگے۔ بہ الفاظ دیگر، جو چیز دنیا کی زندگی میں صرف غیر مرئی نور کی حیثیت رکھتی تھی، وہ آخرت میں قابلِ مشاہدہ اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلے گی۔ مادی تہذیب جس طرح دنیا میں قابلِ مشاہدہ ہے، اسی طرح اسپریچول تہذیب آخرت میں قابلِ مشاہدہ ہوجائے گی۔

مذکورہ آیت میں 'أجرهم ونورهم' کا لفظ نہایت اہم حقیقت کو بتا رہا ہے۔ اِس آیت میں اجر سے مراد جنت کی مادی نعمتیں ہیں اور نور سے مراد وہ تہذیب ہے جو جنت میں ایک روشن واقعہ بن جائے۔ اہلِ جنت ایک طرف 'لکم فیها ما تشتهي أنفسکم' کے بمصداق، جنت کی اعلی نعمتوں سے محظوظ ہوں گے اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ ان کے اندر داخلی سطح پر پیدا ہونے والی ربانی کیفیات جو دنیا میں غیر مرئی حقیقت بنی ہوئی تھیں، آخرت میں وہ قابلِ مشاہدہ نور کی صورت میں نمایاں ہوجائیں گے۔ آخرت میں ظاہر ہونے والے اِس واقعے کو نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اِسی طرح مذکورہ آیت میں اہلِ جنت کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا ہے: 'أتمم لنا نورنا'۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو نے ہمیں جس اعلی ربانی تجربے کی توفیق دی، وہ دنیا میں غیر مرئی بنا رہا۔ اب آخرت میں تو ہمارے ساتھ یہ مزید احسان فرما کہ اِن داخلی ربانی تجربات کو خارجی واقعے کی صورت میں ظاہر کردے۔ جس طرح مادہ پرست انسان کی داخلی دریافت خارجی طور پر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہوئی تھی، اُسی طرح اب تو آخرت میں ہماری داخلی ربانی دریافتوں کو خارجی طور پر نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل کردے۔ یہی مطلب ہے مذکورہ آیت میں اتمامِ نور کا۔

آئڈیا کا متشکّل ہونا

خواہ مادی تہذیب کا معاملہ ہو یا اسپریچول تہذیب کا معاملہ، دونوں کی نوعیت اس اعتبار سے

یکساں ہے۔ دونوں کا وقوع ابتداءً ایک غیر مرئی آئڈیا(invisible idea) کی صورت میں ہوتا ہے، بعد کو وہ خارجی صورت میں متشکل ہوجاتا ہے۔ یہی معاملہ مادی تہذیب کا بھی ہے اور یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ مائکل فریڈے(Michael Faraday, d. 1867)ایک برٹش سائنس داں تھا۔ کچھ تجربات کے دوران اُس کے دماغ میں ایک آئڈیا آیا، جو اب اصطلاحی طور پر الیکٹرومیگنٹزم (electromagnetism) کے طور پر معروف ہے۔ یہ آئڈیا فطرت کے اُس قانون کے بارے میں تھا جس کو الیکٹری سٹی (electricity) کہا جاتا ہے۔ اِس آئڈیا کے تحت یہ فارمولا بنایا گیا کہ بجلی کا مطلب ہے — الیکٹران کا بہاؤ:

Electricity means flow of electrons.

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ براہِ ارست یا بالواسطہ طور پر فطرت کے دوقوانین کا نام ہے — روشنی (light) اورحرکت (motion)۔ فطرت کے اِن دوغیر مرئی قوانین نے جب عملی صورت اختیار کی تواس کے نتیجے میں وہ مرئی ظاہرہ وجود میں آیا جس کو مادّی تہذیب کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی ہے۔ اسپریچول تہذیب ابتداءً ایک مخفی واقعے کی صورت میں ایک بندہ مومن کے سینے میں غیر مرئی طور پر وجود میں آتی ہے۔ اسپریچول تجربہ کیا ہے، اس کو قرآن کی اِن آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے: والذین آمنوا أشد حباً لله (2:165)، ولم یخش إلا الله (9:18)، مما عرفوا من الحق (5:38)، وقلوبهم وجلة (23:60)، في أهلنا مشفقين (52:26)، لاتحزن إن الله معنا (9:40)، وغیرہ۔

مذکورہ حوالے ایک مومن کے سینے میں پیدا ہونے والے اسپریچول تموجات کو بتاتے ہیں۔ یہ اسپریچول تموجات(spiritual waves) اپنی حقیقت کے اعتبار سے بلا شبہہ ہمالیائی تموجات تھے، لیکن دنیا کی زندگی میں وہ غیر مرئی واقعہ بن کر رہ گئے۔ یہ خدا کی شانِ رحمت کے خلاف ہے کہ ایک سائنس داں کی مادی معرفت تو مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہو،

لیکن ایک مومن کی ربانی معرفت محسوس اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل نہ ہو۔

قرآن کے مذکورہ بیانات اِسی سوال کا جواب ہیں۔اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سائنس دانوں کی مادی معرفت خارجی طور پر متشکل ہوکر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں ظاہر ہوئی، اِسی طرح آخرت میں مزید اضافے کے ساتھ یہ ہوگا کہ مومن بندوں کی ربانی معرفت، جو دنیا میں غیر مرئی تھی، وہ آخرت میں خارجی طور پر متشکل ہوگی۔اِسی واقعے کو قرآن میں نورانی ظہور سے تعبیر کیا گیا ہے اور اِسی واقعے کا دوسرا نام آخرت کی ابدی دنیا میں بننے والی اسپریچول تہذیب ہے۔

دو قسم کے چہرے

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ قیامت میں انسانوں کو چھانٹ کر الگ کیا جائے گا، اہلِ جنت الگ اور اہلِ جہنم الگ۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: **يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ** (3:103) یعنی جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم اپنے ایمان کے بعد منکر ہو گئے، تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کے سبب سے۔

''روشن چہرہ'' سے مراد کیا ہے۔اِس سے مراد وہی روشن شخصیت ہے جس کی وضاحت اِس سے پہلے ہوچکی ہے۔''سیاہ چہرہ'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے چہروں پر سیاہ رنگ لگا دیا جائے گا۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی داخلی برائی ظلمت بن کر اُن کے چہرے پر نمایاں ہوجائے گی۔جس غیر ربانی شخصیت کو وہ اپنی جھوٹی تدبیروں سے اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے، وہ ظاہر ہوکر لوگوں کو محسوس طور پر دکھائی دینے لگے گی۔یہ کوئی پراسرار بات نہیں ہے، یہ وہی بات ہے جو دنیا کی زندگی میں بھی جزئی طور پر مشاہدات میں آتی ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ:

Face is the reflection of one's inner personality.

دنیا کی زندگی میں برے لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اندر سے بالکل غیر سنجیدہ تھے، مگر اوپر سے

وہ اپنے آپ کو سنجیدہ ظاہر کرتے تھے۔وہ جھوٹ اور بد دیانتی پر کھڑے ہوئے تھے،لیکن خوب صورت الفاظ کے ذریعے وہ اپنی حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔دل اور دماغ کے اعتبار سے، وہ صرف ایک دنیا پرست انسان تھے،لیکن اپنے ظاہر فریب رویّے سے وہ آخرت پسندی کے اسٹیج پر پُررونق جگہ حاصل کیے ہوئے تھے۔قیامت کے بعد جو آخرت کی دنیا آئے گی، وہاں تمام حقیقتیں اپنی اصل صورت میں ظاہر ہوجائیں گی۔ وہاں ہر عورت اور مرد اپنی اصل داخلی صورت میں نمایاں ہوجائے گا۔یہی مطلب ہے قیامت میں چہروں کے سیاہ ہونے کا۔

برے لوگ وہاں اِس طرح اٹھیں گے کہ ان کے چہروں پر سخت قسم کی حسرت اور ندامت چھائی ہوئی ہوگی۔ وہ بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہوں گے۔ان کا احساسِ محرومی ان کے پورے وجود کو بے قیمت بنائے ہوئے ہوگا۔اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں ان کی کامل مایوسی کی بنا پر ان کا احساس یہ ہوگا کہ وہ حیوان سے بھی زیادہ بے قیمت ہیں۔ان کی بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے چھپانا چاہیں گے،لیکن وہاں انھیں کوئی جگہ نہیں ملے گی جہاں وہ اپنے آپ کو چھپالیں۔

جنت کا معاشرہ

جنت کے معاشرے میں وہ خوش قسمت افراد جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو جنتی شخصیت کی حیثیت سے تیار کیا ہوگا۔جنتی شخصیت کا لفظ کوئی پراسرار لفظ نہیں ہے۔اِس سے مراد وہ افراد ہیں جو انتہائی معنوں میں بلند فکری (high thinking) کے مالک ہوں۔یہی وہ اعلی کردار ہے جس کو قرآن میں خُلقِ عظیم (68:4) یا مزکی شخصیت (20:76) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ اعلی شخصیت والا انسان کون ہے، یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو ہر قسم کے دنیوی محرکات (worldly motivations) سے اوپر اٹھایا، جس نے اپنے آپ کو کامل طور پر متعصّبانہ فکر (biased thniking) سے پاک کیا،جس نے اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے بچایا،جس نے اپنے اندر اُس انسان کی تعمیر کی جس کو کامپلکس فری سول (complex free soul) کہا جاتا ہے،جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کیا کہ وہ انٹیگریٹڈ پرسنالٹی (integrated personality) کا

حامل انسان ہے— یہی وہ صفات ہیں جن سے متصف افراد کو ایک لفظ میں، ربانی انسان کہا جا سکتا ہے۔ انھیں صفات کے حامل افراد کو جنت میں آبادکاری کے لیے منتخب کیا جائے گا۔

جنتی شخصیت کی تعمیر

مذکورہ اعلیٰ ربانی صفات پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ صبر ہے۔ صبر کے ذریعے آدمی اِس قابل بنتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے غیر موافق احوال کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کرے۔ وہ منفی اسباب کے اندر اپنی مثبت سوچ کو مستقل طور پر برقرار رکھے۔ وہ مسائل کو عذر (excuse) نہ بناتے ہوئے اپنا ربانی سفر جاری رکھے۔ اِسی بنا پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ صبر کرنے والے جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ پائیں گے۔ (25:75)

صبر کی اِسی اہمیت کی بنا پر صبر کو اعلیٰ ترین انعام کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ہر عملِ خیر کی لازمی بنیاد ہے۔ اِسی لیے قرآن میں صبر کرنے والوں کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10) یعنی بے شک صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

جسمانی سرگرمیاں، ذہنی سرگرمیاں

انسانی تاریخ کی تصویر اگر یہ ہو کہ اس میں انسان کے جسم (body) کی سرگرمیاں (activities) تو خوب بیان ہوئی ہوں، مثلاً پہلوانی (wrestling) اور باکسنگ (boxing) جیسی سرگرمیاں تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کی گئی ہوں، لیکن انسان کے وجود کا دوسرا اہم تر حصہ جس کو ذہن (mind) کہا جاتا ہے، اس کا سرے سے کوئی ذکر نہ ہو، پوری تاریخ میں انسان کی ذہنی سرگرمیاں (intellectual activities) غیر مذکور (unrecorded) ہو کر رہ جائیں تو ایسی انسانی تاریخ کو نہ صرف نامکمل، بلکہ آخری حد تک بے معنی (meaningless) کہا جائے گا۔

یہ فرضی بات نہیں، بلکہ یہ انوکھا واقعہ عملاً مزید اضافے کے ساتھ پوری دنیا میں پیش آیا ہے۔ وہ اِس طرح کہ انسان کی مادی سرگرمیاں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل (materialized) ہو کر

اپنی پوری صورت میں لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔ مادی تہذیب کو ہر آدمی جانتا ہے اور ہر آدمی اس کو دیکھ رہا ہے۔ مادی تہذیب ہر آدمی کے لیے ایک معلوم واقعہ ہے۔ لیکن انسانی سرگرمیوں کی ایک اور قسم ہے۔ اس کو اسپریچول سرگرمیاں (spiritual activities) کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو انفرادی سطح پر سچے انسانوں کی زندگی میں پیدا ہوئیں۔ وہ پوری طرح غیر مرئی (unobservable) تھیں۔ افراد کی داخلی زندگی میں مکمل طور پر موجود ہونے کے باوجود وہ ظاہری طور پر کبھی متشکل نہیں ہوئیں۔ مثلاً تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے خدا کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنایا، جن کی سوچ تمام تر سچائی اور دیانت داری پر مبنی تھی، جنھوں نے دنیا کے بجائے آخرت کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا، جن کی آخری آرزو یہ تھی کہ اُن کو جنت میں داخلہ ملے، جنھوں نے خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو سمجھا اور ان سے تجاوز نہیں کیا، جن کا ربانی شعور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر وقت داخلی طور پر توبہ واستغفار میں مشغول رہتے تھے۔

یہ تمام اعمال انتہائی اعلیٰ اعمال ہیں، لیکن وہ ہمیشہ کیفیات کی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو کمیاتی اصطلاح (quantitative term) میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ربانی اعمال یا اسپریچول سرگرمیاں افراد کی داخلی دنیا میں پیدا ہوئیں اور پھر افراد کی موت کے ساتھ بظاہر ختم ہوگئیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اسپریچول تہذیب کی حیثیت رکھتی تھیں، مگر اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود وہ کبھی ظاہری طور پر متشکل نہیں ہوئیں جس طرح مادی تہذیب اپنی ظاہری صورت میں متشکل ہوئی۔

آخرت کی دنیا جو قیامت کے بعد آئے گی، وہ اِسی کی تلافی اور تکمیل کے لیے ہے۔ قیامت ایک طرف مادی تہذیب کو پوری طرح نابود کردے گی، اگلے مرحلہ حیات میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا، دوسری طرف یہ ہوگا کہ آخرت کے موافق ماحول میں ماضی کے اسپریچول واقعات پوری طرح متشکل ہوکر ایک اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلیں گے۔

یہ اسپریچول تہذیب ایک ابدی تہذیب ہوگی۔ قیامت سے پہلے کے دورِ تاریخ میں دونوں قسم کے افراد باہم ملے ہوئے تھے، لیکن قیامت کے بعد کے دورِ تاریخ میں دونوں کو

چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے گا۔ (27:83)

خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، قیامت سے پہلے کا دورِ حیات انفرادی اعتبار سے تعمیرِ شخصیت کا دور تھا، وہ اجتماعی اعتبار سے تعمیرِ تہذیب کا دور نہ تھا۔ آخرت کی دنیا میں یہ ہوگا کہ جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کی، وہ رد کر دئے جائیں گے اور جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر کی، وہ خدا کے مطلوب بندے ٹھہریں گے۔ ایک گروہ کا کیس کامیابی کا کیس ہوگا اور دوسرے گروہ کا کیس ناکامی کا کیس۔ (42:7)

قرآن میں دونوں قسم کے افراد کو مختلف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کامیاب افراد روشن چہروں (bright faces) والے ہوں گے اور ناکام افراد سیاہ چہروں (dark faces) والے۔ کامیاب افراد ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی پائیں گے اور ناکام افراد ابدی طور پر حسرت کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

خاتمۂ کلام

اللہ کو مطلوب تھا کہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل دنیا کے آغاز سے لے کر اس کے خاتمے تک جاری رہے۔ اللہ نے دیکھا کہ انسان کو دی گئی آزادی کی بنا پر یہ تسلسل مجموعے کی سطح پر جاری نہیں ہوسکتا، اس لئے اللہ نے اس کو افراد کی سطح پر جاری کر دیا۔ چناں چہ انسانی مجموعے کی سطح پر اگر چہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل جاری نہیں ہے، لیکن افراد کی سطح پر یہ تسلسل مکمل طور پر جاری ہے۔ اِس سلسلے کا پہلا فرد غالباً ابتدائی دور کا ہابیل ابن آدم تھا، جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے (5:27) اور اِس سلسلے کا آخری فرد غالباً دورِ آخر کا وہ رجلِ مومن ہوگا جس کا ذکر صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2938)

انسان کی آزادی کی بنا پر اس دنیا میں اسپریچول تہذیب کا اجتماعی تسلسل عملاً ناممکن ہے، لیکن اسپریچول تہذیب کا انفرادی تسلسل پوری طرح ممکن ہے اور بلاشبہہ وہ ہر دور میں اور ہر زمانے میں جاری رہا ہے۔ اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

آپ ایک وسیع کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں آپ کے سامنے کی میز پر ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بظاہر کمرے میں صرف کچھ مادی چیزیں ہیں۔ مثلاً دیوار، کرسی، میز، وغیرہ۔ اِن چیزوں کو آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ وہاں ایک اور چیز ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی، مگر وہ مکمل طور پر موجود ہے۔ یہ دوسری چیز غیر مرئی لہروں (invisible waves) کی صورت میں ہے۔ اِس غیر مرئی دنیا میں زندہ انسان ہیں، آوازیں ہیں اور مختلف قسم کی عملی سرگرمیاں ہیں، لیکن بظاہر وہ مکمل طور پر غیر مرئی ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنے ٹی وی سیٹ کو آن کرتے ہیں تو اچانک اسکرین پر ایک پوری دنیا نظر آنے لگتی ہے، جو اُسی طرح کامل اور بامعنی ہے جس طرح ٹی وی سیٹ کے باہر کی دنیا۔

اِس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسپریچول تہذیب کیا ہے۔ وہ کس طرح آج بظاہر غیر موجود ہے اور آخرت کی دنیا میں وہ مکمل طور پر موجود ہوجائے گی۔ آخرت میں پیش آنے والا یہی وہ واقعہ ہے جس کے ایک پہلو کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (41:21)۔

آخرت میں اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کا واقعہ قدیم زمانے میں صرف ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں ٹیلی ویژن کی ایجاد گویا کہ اِس معاملے کا ایک پیشگی مظاہرہ ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد نے اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کو مشاہداتی سطح پر قابلِ فہم (understandable) بنا دیا ہے۔

جنتی تہذیب

قرآن کی سورہ یاسین میں اہلِ جنت کے ذکر کے تحت یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ (36:55) یعنی بے شک، اہلِ جنت آج ایک عظیم مشغلے میں ہوں گے، خوش— ہرآئینہ اہلِ بہشت امروز درکارے باشند، شاداں:

Surely the dwellers of the paradise shall on that day be in an occupation quite happy.

آخرت میں سچے اہلِ ایمان کو جنت میں داخلہ ملے گا۔ وہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی گزاریں گے۔ جنت ہر اعتبار سے، پرفکٹ (perfect) ہوگی۔ وہاں ہر اعتبار سے، اہلِ جنت کے لیے فل فل مینٹ (fulfilment) کا سامان ہوگا۔ وہاں اہلِ جنت نہ کبھی حزن کا شکار ہوں گے اور نہ وہ کبھی اکتاہٹ (boredom) میں مبتلا ہوں گے۔

تاہم جنت صرف آرام وعیش کی جگہ نہ ہوگی، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ اہلِ جنت کے لیے ایک اعلیٰ ترین سرگرمی کا مقام ہوگا۔ مذکورہ آیت میں اِس حقیقت کو بتانے کے لیے 'شغل' کا لفظ آیا ہے۔ شغل کے لفظی معنی مشغلہ (activity) کے ہیں۔ شغل کا لفظ اِس آیت میں نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نحوی قاعدے کے مطابق، تنکیر برائے تفخیم ہوتی ہے۔ اِس لیے یہاں شغل سے مراد ہے ایک عظیم مشغلہ۔

اِس عظیم مشغلہ سے کس قسم کا مشغلہ مراد ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد وہی مشغلہ ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے عظیم مشغلہ تھا۔ یہی مشغلہ بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ آخرت میں بھی ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اِس مشغلہ کو دنیا میں قوانینِ فطرت کی دریافت (discovery of natural laws) کہا جاتا ہے، اِسی کو قرآن میں کلمات اللہ (31:27) کہا گیا ہے۔ دنیا میں کلمات اللہ کی دریافت ابتدائی طور پر ہوئی تھی۔ آخرت میں دوبارہ 'کلمات اللہ' کی دریافت ابدی طور پر اور غیر مختتم طور پر جاری رہے گی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے کلمات ناقابلِ قیاس حد تک زیادہ ہیں، اتنے زیادہ کہ اگر اُن کو لکھا جائے تو وہ ضبطِ تحریر میں نہ آسکیں۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (31:27) یعنی اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

'کلمات اللہ' کا لفظی مطلب ہے اللہ کی باتیں (word's of God)۔ اللہ کا کلمہ سادہ طور پر صرف کلمہ نہیں ہوتا، وہ ایک محکم فیصلہ یا اٹل قانون ہوتا ہے۔ کلمات اللہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مختلف مقامات پر 'امرِ رب' یا 'امر اللہ' کہا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اس کو قوانینِ الٰہیہ (divine laws) کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اہلِ سائنس اِس واقعے کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کہتے ہیں۔

یہی قوانینِ الٰہیہ یا قوانینِ فطرت ہیں جن کی بنیاد پر کائنات کی تخلیق ہوئی اور یہی قوانین ہیں جن کے تحت نہایت محکم انداز میں کائنات کا پورا نظام مسلسل طور پر چل رہا ہے۔ یہی قوانین انسان کے لیے اس کی تمام فکری اور عملی ترقیوں کا ماخذ ہیں۔ اِنھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان معرفت حاصل کرتا ہے۔ اِنھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان تخلیق کی معنویت کو دریافت کرتا ہے۔ انھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان اللہ کی عظمت (glory) سے آشنا ہوتا ہے۔ انھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان کے اندر وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو اللہ کے لیے حبّ شدید اور خوفِ شدید کہا جاتا ہے۔ انھیں قوانین پر تدبر کرکے آدمی اپنے اندر وہ ربانی شخصیت پیدا کرتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ قوانین الٰہیہ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ انسان ابد تک اُن میں تدبر کرتا رہے اور وہ کبھی ختم نہ ہوں۔

یہی قوانین یا قوانینِ فطرت ہی تمام علوم کا خزانہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں جس ظاہرے کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے، وہ اِنھیں قوانین الٰہیہ یا قوانین فطرت کی جزئی دریافت کے

نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔سائنس کے علوم تمام تر اِنھیں قوانین میں غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں۔ یہی قوانین، حکمت (wisdom) کا خزانہ ہیں۔حقیقت ہے کہ اِن قوانین کے ساتھ انسان انسان ہے۔اگر اِن قوانین کو انسان سے جدا کردیا جائے تو انسان صرف ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے، وہ اس کی صرف یہ خصوصیت ہے کہ وہ فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے اُن کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔

امریکی مصنف الون ٹافلر (Alvin Tafler) کی ایک کتاب ’فیوچر شاک‘ (*Future Shock*) ہے، جوپہلی بار 1970 میں امریکا سے شائع ہوئی۔اس نے اِس کتاب میں کہا تھا کہ ہمارا انڈسٹریل ایج (industrial age) مزید ترقی کرکے اب سپر انڈسٹریل ایج (super industrial age) میں داخل ہونے والا ہے۔مغربی مصنف نے اپنی یہ پیشین گوئی بیسویں صدی میں کی تھی، لیکن صدی کے آخر میں اس کا یہ خواب منتشر ہوگیا۔ماحولیاتی مسائل (ecological problems) نے بتایا کہ زمین پر انسانی تہذیب کی آخر حد آچکی ہے۔اِس زمین پر انسانی تہذیب کا سفر مزید آگے جاری رہنے والا نہیں۔

تہذیب کیا ہے۔تہذیب تمام تر قوانین فطرت پر مبنی ایک ظاہرہ ہے۔قوانینِ فطرت سے الگ تہذیب کا کوئی وجودنہیں۔ جب یہ واقعہ ہے کہ قوانینِ الٰہیہ یا قوانین فطرت کی کوئی حد نہیں تو لازمی طور پر یہ بھی ہونا چاہئے کہ تہذیب کی ترقی کی کوئی حد نہ ہو،تہذیب کی ترقی کا سفر ابدی طور پر جاری رہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن ہم کو رہنمائی دیتا ہے۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ انسانی کا سفر موجودہ دنیا کے دورِ حیات میں ختم نہ ہوگا، بلکہ وہ مزید ترقی کے ساتھ زیادہ اعلیٰ صورت میں آخرت کے ابدی دورِ حیات میں جاری رہے گا۔

قرآن میں یہ بات،نعوذ باللہ، بطور بوسٹنگ (boasting) نہیں ہے، بلکہ وہ بطور پیشین گوئی ہے،یعنی اِس قرآنی بیان میں دراصل یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ تہذیب کا نامکمل سفر اپنی تکمیل کو پہنچے۔موجودہ دنیا میں ’کلمات اللہ‘ کا جو اظہار جزئی صورت میں ہوا ہے،

آخرت کی دنیا میں اس کا اظہار کامل صورت میں ہوگا۔

قرآن یہ خوش خبری دیتا ہے کہ انسانی تہذیب کا سفر ادھورا نہیں رہے گا، بلکہ وہ مزید ترقی کے ساتھ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ارتقا کا جو موقع انسان کو حیاتِ دنیا میں نہیں ملا تھا، وہ آخرت کی زندگی میں مزید اضافے کے ساتھ اس کو حاصل ہو جائے گا۔

تہذیب کے دو دور

تہذیب کے دو دور جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اُن کا حوالہ قرآن میں صراحتاً موجود ہے۔ تہذیب کا پہلا دور جو قوانینِ فطرت کی جزئی دریافت کے ذریعے موجودہ دنیا میں ظہور میں آئے گا، اس کا ذکر قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اِن الفاظ میں آیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یعنی عن قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں (signs) دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر پورطرح آشکارا ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں قوانینِ الٰہیہ پر مبنی تہذیب کے اُس دور کا ذکر ہے جو موجودہ دنیا میں پیش آنے والا تھا۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں سائنس کے ظہور کی صورت میں واقعہ بن چکی ہے۔ سائنس کی دریافتوں نے یہ کیا ہے کہ آفاق وانفس میں جو خدائی نشانیاں (signs of God) موجود تھیں، اُن کو جزئی طور پر دریافت کیا اور اِس طرح انسان کے لیے تبیینِ حق کے نئے مواقع کھول دئے۔ اِن دریافتوں کے ذریعے انسان کو ایک نیا فریم ورک (frame work) ملا۔ اِس کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا کہ انسان خالص علمی اور عقلی سطح پر اللہ کی معرفت حاصل کرے۔

قوانینِ الٰہیہ پر مبنی تہذیب کا دوسرا عظیم تر ظہور آخرت کے دورِ حیات میں پیش آئے گا۔ تہذیب کے اِس دوسرے دور کو ربانی تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور اپنے تمام کمالات کے ساتھ ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اِس دوسرے دورِ تہذیب کا ذکر قرآن کی سورہ الکہف میں اِن الفاظ میں آیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ○ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ○ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ

تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا (18:107-109) یعنی بے شک جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے عملِ صالح کیا، اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے۔ اِس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہوجائے تو سمندر ختم ہوجائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اسی کی مانند اور سمندر ملا دیں۔

قرآن کی اِن آیات پر غور کیجیے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ’’جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیا، یعنی جن لوگوں نے دریافت کی سطح پر اللہ کی معرفت حاصل کی اور پھر اس معرفت کے مطابق، اپنی عملی زندگی کو ربانی زندگی بنا دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ’’اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے‘‘، یعنی آخرت میں اُن کو اللہ کے آفاقی گیسٹ ہاؤس (universal guest house) میں ابدی طور پر رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ اِس کے بعد فرمایا کہ ’’اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے نکلنا نہ چاہیں گے‘‘۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ اگر اس کو یکساں قسم کی مادی نعمتیں دی جائیں تو یہ نعمتیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، کچھ دنوں کے بعد وہ ان کی یکسانیت کی بنا پر بورڈم (boredom) کا شکار ہوجائے گا، وہ اُن سے محظوظ نہ ہوسکے گا۔ اِس کے بعد فرمایا کہ ’’وہ جنت سے نکلنا نہ چاہیں گے‘‘۔ اِس طرح کی کیفت پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اہلِ جنت کو مادی نعمتوں کے سوا ایک اور چیز حاصل ہو اور وہ ہے — بار بار نئی چیزوں کا ملنا، بار بار نئی دریافتوں کا تجربہ پیش آنا، مسلسل طور پر فکری ارتقا کا جاری رہنا جن کی بنا پر اہلِ جنت کی تخلیقیت (creativity) کبھی ختم نہ ہوگی۔ اہلِ جنت کی شخصیت میں یہ ارتقا معرفتِ خداوندی میں ارتقا کے ذریعے پیش آئے گا۔

جنت میں تخلیقی سرگرمیوں (creative activities) کے جو اتھاہ مواقع ہوں گے، اُن کو آیت کے اگلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور وہ ہے اہلِ جنت کے ذریعے ’کلمات اللہ‘ کی ابدی انفولڈنگ (eternal unfolding)۔ قرآن کے مطابق، ’کلمات اللہ‘ کی تعداد لامحدود ہے۔

سائنس کے ذریعے اِن 'کلمات اللہ' کا جزئی ظہور (partial unfolding) ہوا، جس کے نتیجے میں دنیا کی تہذیب وجود میں آئی۔ آخرت میں اہلِ جنت کے ذریعے 'کلمات اللہ' کا کامل ظہور ہوگا۔ اِس کے نتیجے میں وہ دورِ کمال وجود میں آئے گا جس کو جنتی تہذیب کہا جاتا ہے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان جو یہاں پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو تیاری میں لگا دیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر کسی نہ کسی شعبے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر آدمی آخری حد تک یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خاص ہنرمندی (skill)، کوئی خاص لیاقت (qualification)، کوئی خاص مہارت (expertise) پائی جائے، تاکہ وہ موجودہ دنیا میں قائم شدہ تہذیب کے نقشے میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرسکے۔ ہر عورت اور مرد زندگی کی اِس حقیقت کو جانتے ہیں اور اس کے لیے پوری طرح سرگرم رہتے ہیں۔

یہی معاملہ آخرت میں بننے والی بلندتر تہذیب کا ہے۔ وہاں بھی سرگرمیاں ہوں گی، وہاں بھی مناصب ہوں گے، وہاں بھی ہر قسم کے اعلیٰ شعبے ہوں گے۔ جنتی دنیا کے ان اعلیٰ مواقع کو حاصل کرنے کے لیے بھی تیار ذہن اور تربیت یافتہ افراد درکار ہیں۔ موجودہ دنیا ایک اعتبار سے، اِسی اعلیٰ تیاری کی تربیت گاہ ہے۔

موجودہ دنیا کے حالات میں لوگوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر وہ ربانی صلاحیت پیدا کریں جو اُن کو اِس قابل بنائے کہ وہ آخرت میں بننے والی برتر تہذیب کے مناصب کے لیے منتخب کیے جاسکیں اور پھر ابدی طور پر نہ صرف آرام وعیش کی زندگی گزاریں، بلکہ ایک ایسے تہذیبی سفر کا حصہ بن جائیں جس کی ترقیاں کبھی ختم نہ ہوں۔ یہ لامحدود خوشی (endless pleasure) کی زندگی ہوگی، جو اللہ کی خصوصی رحمت سے اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔

موجودہ دنیا میں کسی آدمی کو جو عزت کا مقام ملتا ہے، وہ اِس بنیاد پر ملتا ہے کہ اس نے تہذیب کے تقاضوں کے مطابق، اپنے آپ کو کتنا تیار کیا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کی جنتی تہذیب میں بھی ہوگا۔ موجودہ دنیا کی تہذیب میں ہر آدمی کو ڈاکٹر، انجینئر، اسکالر اور ٹکنکل اکسپرٹ، وغیرہ کی نسبت سے

مقام ملتا ہے۔آخرت میں عارف، متقی اور خاشع، وغیرہ کی نسبت سے اس کو مقام حاصل ہوگا۔ دنیا میں آدمی کو دنیوی تقاضے کے مطابق تیاری کی نسبت سے اپنا مقامِ استعمال ملتا ہے۔آخرت میں ہر آدمی کو ربانی تقاضے کے مطابق تیاری کی نسبت سے اپنا مقامِ استعمال ملے گا۔

خلاصۂ کلام

تہذیب (civilization) کیا ہے۔تہذیب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، کلماتِ الٰہیہ کے ظہور کا نام ہے۔ قیامت سے پہلے کے دورِ حیات میں یہ ظہور جزئی طور پر ہوگا اور قیامت کے بعد کے دورِ حیات میں کامل طور پر۔موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل تھی، اِس لیے موجودہ دنیا میں کلماتِ الٰہیہ کے جزئی ظہور سے جو تہذیب بنی، اس میں انسانی فساد کی بنا پر منفی اجزا شامل ہو گئے۔ لیکن آخرت میں کلماتِ الٰہیہ کے کامل ظہور سے جو تہذیب وجود میں آئے گی، وہ انسانی فساد سے پوری طرح پاک ہوگی۔ اِس لیے آخرت میں ظہور میں آنے والی تہذیب تمام تر مثبت اجزا پر مبنی ہوگی۔ اِسی لیے اس کو جنتی تہذیب کہا گیا ہے۔

قرآن میں جنت کے حوالے سے ارشاد ہوا ہے کہ: لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)؛ یعنی انسان کو چاہیے کہ وہ موجودہ دنیا کو ایک موقع (opportunity) کے طور پر لے۔وہ اپنے آپ کو اِس اعتبار سے تیار کرے کہ وہ آخرت میں بننے والی جنتی تہذیب میں اپنے لیے باعزت جگہ پا سکے۔اِسی لیے کہا گیا ہے کہ موجودہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت کی دنیا دار الجزا۔

قیامت کے دروازے پر

25 جون 2008 کی صبح کو میں آل انڈیا ریڈیو سے خبریں سن رہا تھا۔ خبروں کے آخر میں حسب معمول کھیل کی کمنٹری آنے لگی۔ ومبلڈن (Wimbledon) سے رپورٹ دیتے ہوئے، رپورٹر نے کہا کہ — ندال (Rafael Nadal) زبردست جیت کے دروازے پر:

Nadal on the threshold of a landslide victory.

اِن الفاظ کو سُن کر میں نے سوچا کہ لوگ کتنی زیادہ بڑی بھول میں مبتلا ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عظیم کامیابی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ندال سمیت پوری انسانیت آج قیامت کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے:

Nadal as well as whole humanity is on the threshold of Doomsday.

قرآن کی سورہ المومنون میں تمام انسانیت کو خطاب کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے فرمایا: تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے:

Do you think that we created you without any purpose,
and that you shall not be returned to Us. (23:115)

قرآن میں اِس طرح کی مختلف آیتیں ہیں جن میں خدا کا کری ایشن پلان (creation plan) بتایا گیا ہے۔ اِس کے مطابق، خدا نے ایک آئڈیل دنیا بنائی جس کو جنت (paradise) کہا گیا ہے۔ یہ آئڈیل دنیا ابدی ہے (2:25)۔ وہ خوف اور حُزن سے خالی ہے (35:34)۔ وہاں انسان کے لیے کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کا سامان موجود ہے (41:31)۔

اِس کے بعد خدا نے سیارۂ زمین کو بنایا اور پھر یہاں انسانی نسل کو آباد کیا۔ خدا نے انسان کو آزادی (freedom) عطا کی اور زمین پر بقاءِ حیات کے تمام اسباب فراہم کیے، جن کے مجموعے کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی پلان کے

مطابق، سیارۂ زمین کی حیثیت ایک سلیکشن گراؤنڈ (selection ground) کی ہے۔ خدا کے فرشتے یہاں رات دن انسان کا ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اعلیٰ ریکارڈ کے مطابق، جنت کے مستحق ٹھیریں گے، اُن کو منتخب کرکے موت کے بعد کی ابدی زندگی میں جنت میں بسایا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ کے لیے خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں گے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اِس آیت میں کہی گئی ہے: ''بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے'':

> Glory is to God in whose hand is the kingdom, and He has power over all things; who created death and life, so He may test you, which of you is best in action. He is the mighty, the Most Forgiving. (67: 1-2).

انسانِ اوّل (آدم) کے بعد بے شمار لوگ پیدا ہوکر زمین پر آباد ہوئے اور بدستور پیدا ہوکر آباد ہورہے ہیں، مگر خدا کو صرف وہ عورت اور مرد مطلوب ہیں جو اُس کے تخلیقی پلان کے مطابق، احسنُ العمل (best in deed) ثابت ہوں۔

خدا کے اِس تخلیقی پلان کے مطابق، انسان اگرچہ ابدی مخلوق (eternal being) کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے، لیکن سیارۂ زمین پر اس کو ابدی طور پر نہیں رہنا ہے، موجودہ سیارۂ زمین اس کی عارضی قیام گاہ ہے۔ اِسی عارضی مدت کے خاتمے کے دن کا نام قیامت (Doomsday) ہے۔

سیارۂ زمین پر خدا نے وہ تمام اسباب اکھٹا کیے جو مذکورہ تخلیقی پلان کے مقصد کی نسبت سے ضروری تھے۔ اِن اسباب کی حیثیت وہی ہے جو امتحان ہال (examination hall) میں موجود سامان کی ہوتی ہے۔ یہ سامان، امتحان کی ضرورت کے تحت، امتحان ہال میں اکھٹا کیے جاتے ہیں۔ امتحان کے ختم ہوتے ہی ان کی مطلوبیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ طالب علم کو یہ اسباب

صرف امتحان کے سامان کے طور پر دیے جاتے ہیں، نہ کہ ذاتی انعام کے طور پر۔ اس لیے امتحان کے ختم ہوتے ہی طالبِ علم سے یہ تمام اسباب چھن جاتے ہیں۔

اِس معاملے میں خدا کے تخلیقی پلان کا ایک اور پہلو وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر 8 میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (8:42) یعنی جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے، وہ حجت کے ساتھ زندہ رہے۔

اِس قانونِ الٰہی کا ایک پہلو وہ ہے جو قیامت سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت جب آئے گی تو وہ براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آئے گی، لیکن انسانی معاملات میں خدا اپنا فیصلہ پُراسرار بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ اِس طرح کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو پوری طرح معقول اور جائز (justified) معلوم ہو۔ حالات بتاتے ہیں کہ، قرآن کے الفاظ میں، آنے والی گھڑی بالکل قریب آچکی ہے، اور کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں (53:57-58)۔

اِس معاملے کی پہلی علامت وہ تھی جس کو پری فائنل وارننگ (pre-final warning) کہا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے ٹوٹنے کی صورت میں پیش آیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، 1917 میں سوویت روس قائم ہوا۔ اِس کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ اس کو غیر معمولی توسیع و ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ 1957 میں سوویت روس نے پہلا راکیٹ (Sputnik) خلا میں بھیجا، تو اس کو عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

لیکن سوویت یونین، یا کمیونسٹ ایمپائر کی آئڈیالوجی میں آغاز ہی سے ایک ایسی چیز شامل تھی جو خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی۔ خدا نے اپنے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو لازمی طور پر آزادیٔ انتخاب (freedom of choice) عطا کیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر ٹیسٹ (امتحان) ممکن نہیں۔ لیکن کمیونسٹ ایمپائر نے خود ساختہ نظریے کے تحت، اپنے علاقے میں مذہبی آزادی کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ کسی بھی قسم کی مذہبی سرگرمی اس کے اندر خلافِ قانون

قرار پا گئی۔ حکومتی سطح پر اینٹی ریلجس ڈپارٹمینٹ قائم ہوا۔ اس کا کام یہ تھا کہ کمیونسٹ ایمپائر کے اندروہ ہر قسم کی مذہبی سرگرمی کو کچل کر ختم کردے۔

یہ بات واضح طور پر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی، اور اِس قسم کی کوئی چیز خدا کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جو خدا کے تخلیقی پلان کی منسوخی کے ہم معنیٰ ہو۔ چناں چہ سوویت یونین میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ 1991 میں سوویت یونین کا سیاسی محل تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر ختم ہوگیا۔ یہ گویا کہ مادّی تہذیب کے فائنل خاتمہ سے پہلے دیا جانے والا ایک خدائی انتباہ (divine warning) تھا۔ لیکن اِس کے بعد بھی انسان نے اِس واقعے سے سبق نہیں لیا۔ اِس کے بعد بھی اُس نے ایسی سرگرمیاں جاری رکھیں جو خدا کے تخلیقی پلان سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

خدا نے اپنے تخلیق پلان کے مطابق، انسان کے لیے دو نہایت اہم چیزوں کا انتظام کیا ہے — اِن میں سے ایک کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے کو مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے برسوں میں انسان نے اِن دونوں فطری نظاموں کو ناقابلِ تلافی حد تک تباہ کردیا ہے اور اِس طرح اُس نے اِس کا جواز (justification) کھودیا ہے کہ اس کو سیارۂ زمین پر مزید باقی رکھا جائے۔ کیوں کہ انسان کو زمین کے فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا کام کرنا تھا، اس کو یہ رائٹ نہیں تھا کہ وہ زمین کے فطری نظام کو تباہ کرڈالے۔

لائف سپورٹ سسٹم

خدا نے جب سیارۂ زمین پر اِنسان کو بسایا، تو یہاں اُس نے وہ تمام مادّی سامان مہیا کیے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور بقا کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی اور غذا، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اِن انتظامات کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو اس کے خالق نے ایک محدود مدت کے لیے بسایا ہے، اِس لیے یہ انتظامات محدود پیمانے پر کیے گیے ہیں۔ اِن انتظامات کو لامحدود طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام، انسان کی فطری ضرورت (natural need) کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اب اگر انسان ایسا کرے کہ وہ ہوس پرستانہ تعیش (luxury) کے لیے لامحدود طور پر اُن کو استعمال کرنے لگے، تو اِس سے فطرت کا نظام غیر متوازن ہوجائے گا اور وہ چیز پیدا ہوجائے گی جس کو قرآن میں فساد (7:85) کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں عملاً ایسا ہی پیش آیا ہے۔ انسان نے اپنی لامحدود خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اور تعیّشات کا انبار اپنے گرد اکھٹا کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتیں قائم کیں۔ بڑی بڑی موٹر کاریں بنائیں، بے شمار قسم کے کنزیومر گڈس (consumer goods) تیار کیے، ہر چیز کو ائر کنڈیشنڈ کرنے کی کوشش کی، ہتھیار کی صنعت (armament industry) کو چلانے کے لیے بڑے بڑے اسلحہ ساز کارخانے قائم کیے، وغیرہ۔

اِس قسم کی چیزیں انسان کی ضرورت (need) نہ تھیں، وہ صرف اس کی ہوس (greed) کا تقاضا تھیں۔ اِس انتخابی دنیا میں خدا کا نظام ضرورت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، نہ کہ ہوس کی بنیاد پر۔ مگر اتباعِ ہویٰ (18:28) کی وجہ سے یہ توازن ٹوٹ گیا۔ اِس طرح انسان، فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ گیا۔ اِس کا بھیانک نتیجہ ائر پلوشن، واٹر پلوشن، نوائز پلوشن اور پلاسٹک پلوشن، وغیرہ کی صورت میں نکلا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں فَسَادٍ فِي الأَرْضِ (7:85) کہا گیا ہے، یعنی فطرت میں قائم کردہ توازن (balance) کا ٹوٹ جانا۔ موجودہ زمانے میں یہ واقعہ بڑے پیمانے پر پیش آیا ہے۔ قدیم روایتی زمانے میں انسان، فطرت (nature) کو صرف بقدر ضرورت استعمال کرتا تھا۔ اِس لیے دنیا میں فطری توازن کا نظام بگڑنے نہیں پایا۔

موجودہ صنعتی تہذیب کے زمانے میں انسان کو جدید طاقتوں پر دست رس حاصل ہوگئی۔ اب اُس نے لامحدود طور پر فطرت (nature) کا استعمال شروع کردیا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کا توازن مختل ہوکر رہ گیا۔

انسان نے جو کارخانے بنائے، اُن میں ایسا ایندھن استعمال ہوتا تھا جس سے وہ سنگین مسئلہ پیدا ہوا جس کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری فضا، مضر گیسوں سے بھر گئی۔ سمندر، خالص پانی کی فراہمی کا ذریعہ تھے، لیکن صنعتی کثافتیں جوندیوں وغیرہ کے ذریعے بہہ کر سمندر میں پہنچیں۔

ان صنعتی کثافتوں کے نتیجے میں یہ ناقابلِ حل مسئلہ پیدا ہوا کہ سمندروں میں پانی کا عظیم ذخیرہ پنچانوے فی صد تک خطرناک طور پر آلودگی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ حالات کی شدت کے نتیجے میں صحت بخش کیڑے مکوڑے (insects) روزانہ بہت بڑی تعداد میں مر کر ختم ہو رہے ہیں، جن کا کوئی بھی بدل فراہم کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

جدید صنعتوں ہی کے نتیجے میں وہ سپر پرابلم پیدا ہوا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ تمام دنیا کے سائنس داں متفقہ طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین کے اوپر لائف سپورٹ سسٹم میں جو خطرناک بگاڑ آیا ہے، وہ ناقابلِ اصلاح (irreversible) ہے۔ تمام سائنس داں جدید سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ بیس سال کے اندر حالات اتنے زیادہ خراب ہوجائیں گے کہ سیارۂ زمین، انسان جیسی کسی مخلوق کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) ہوجائے گا۔

موجودہ سیارۂ زمین، انسان کو بقدرِ ضرورت استعمال کے لیے دیا گیا تھا، لیکن انسان نے تجاوز کرکے زمین کو بقدرِ تعیّش استعمال کرنا چاہا۔ اِس کے نتیجے میں انسان نے زمین پر اتنا زیادہ بگاڑ پیدا کردیا کہ اُس نے زمین پر مزید رہنے کا جواز کھو دیا۔ بظاہر اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے، جب کہ انسان کو زمین سے بے دخل کردیا جائے۔ اِسی بے دخلی کے دن کا دوسرا نام قیامت ہے۔

مارل سپورٹ سسٹم

خدا نے انسان کو فطرتِ صحیحہ (30:30) پر پیدا کیا۔ اُس نے انسان کے اندر پیدائشی طور پر بُرائی اور بھلائی کی تمیز رکھ دی (91:8) پھر خدا نے انسان کے اندر ضمیر (conscience) رکھ دیا، جس کو قرآن میں نفسِ لوّامہ (75:2) کہا گیا ہے۔ یہ نفسِ لوامہ، ہر انسان کے لیے ایک داخلی گائڈ کی حیثیت

رکھتا ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو صحیح اور غلط کا علم دیتا رہتا ہے۔

یہ پورا نظام جو نفسیات کی سطح پر قائم کیا گیا ہے، وہ گویا کہ انسان کے لیے ایک قسم کا مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو درست رویّے پر قائم رکھے، وہ انسان کو اخلاقی بگاڑ کی طرف جانے سے روکتا رہے۔

موجودہ زمانے میں انسان نے یہ سنگین جرم کیا کہ اُس نے خدا کے قائم کردہ اِس مارل سپورٹ سسٹم کو تباہ کردیا۔ مغربی تہذیب کے فروغ کے بعد ایسے نظریے وضع کئے گئے جنھوں نے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ نیچر کوئی چیز نہیں، سب کچھ صرف نرچر (nurture) پر منحصر ہے، یعنی یہ دراصل سماجی اثرات ہیں جو کسی انسان کی شخصیت کو بناتے ہیں۔

اِس فلسفیانہ اسکول کو عام طور پر بہیویر ازم (Behaviourism) کہا جاتا ہے۔ اس نظریے نے لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ربانی فطرت (divine nature) کوئی حقیقی چیز نہیں، وہ صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے:

Behaviourism: The doctrine that valid data consists only of the observable and measurable in individual's responses, not valuing subjective or introspective accounts.

اِسی طرح وہ فلسفہ وضع کیا گیا جس کو اِفادی نظریہ (Utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے نے اِفادیت پسندی کو وہ جگہ دے دی جو فطرت کے نظام کے تحت، اخلاقی اقدار (moral values) کو حاصل تھی۔ ذاتی مفاد نے زندگی میں وہ حیثیت اختیار کرلی جو اِس سے پہلے اعلیٰ اصولی معیارات کو حاصل تھی۔ اِس نظریے کا خلاصہ اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

Utilitarianism: The doctrine that the greatest happiness of the greatest number should be the aim of all action. The doctrine that the worth, or value of anything is determined solely by its utility.

اِس نظریے نے ذاتی خوشی، یا ذاتی مفاد کو کسی شخص کی زندگی میں واحد قابلِ لحاظ چیز قرار دے دیا۔ اِس نظریے کے مطابق، جس چیز سے آدمی کو خوشی ملے اور جس میں اس کو اپنا مادّی فائدہ

نظر آئے، وہ اس کو بلا تأمل اختیار کر سکتا ہے۔ اِس معاملے میں ضمیر، یا فطرت کی آواز کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس نظریے نے فطرت کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کو زندگی کے معاملات میں اضافی (relative) قرار دے دیا۔ اِس طرح، فطرت کا قائم کیا ہوا اخلاقی نظام عملاً غیر موثر ہو کر رہ گیا۔

اِسی طرح، مارل سپورٹ سسٹم کو غیر موثر بنانے میں سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنے نظریات کے ذریعے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ مطلق اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہیں۔ اُس نے بتایا کہ نفسیاتی پیچیدگیاں ابتدائی دور کے جذباتی صدمات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وہ دبی ہوئی صنفی توانائی کا اظہار ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ نے اپنے اِس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کی تکنیک اور خواب کی صنفی تعبیر کا سہارا لیا، اس طرح اس نے بتایا کہ نفسیاتی مسائل، دبے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ بعد کی زندگی میں شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کم عمری سے صنفی تعلقات قائم کیے جائیں:

> ...Symptoms were caused by early trauma, and were expressions of repressed sexual energy. Devised 'free association' technique and dream interpretation discover repressed experiences. Emphasized importance of infantile sexuality in personality's develpment in later life.

مذکورہ قسم کے نظریات، انسان کے ہوس پرستانہ جذبات کے عین مطابق تھے۔ چناں چہ ان کو آج کی دنیا میں خوب پھیلاؤ حاصل ہوا۔ اِسی کے نتیجے میں اِباحیت پسند سوسائٹی (permissive society) بنی۔ اِسی کے نتیجے میں ''آج'' میں جینے کا نظریہ بنا، جس کو عام طور پر رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ (right here, right now) کہا جاتا ہے۔

اِسی نظریے کے نتیجے میں برہنگی (nudity) ماڈرن کلچر کا حصہ بن گئی۔ ڈوز اینڈ ڈونٹس (do's and don'ts) کا قدیم نظریہ، لوگوں کو بے معنی نظر آنے لگا۔ شراب اور سیکس جیسی چیزوں پر

عائد رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ انسان کے مطالعے کے لیے حیوان کو معیار سمجھ لیا گیا۔ زندگی کا مقصد صرف یہ بن گیا کہ — کماؤ اور عیش کرو۔

پریس میں ایک واقعہ آیا ہے کہ مغربی دنیا کے ایک شخص نے سرجری کے ذریعے اپنی صنف تبدیل کی۔ وہ مرد کے بجائے عورت بن گیا۔ پھر اس نے مرد جوڑے سے تعلقات قائم کیے۔ اُس کو حمل قرار پایا۔ اِس معاملے کو فخر کے ساتھ بتاتے ہوئے، اُس نے کہا کہ — عورت ہونا، یا مرد ہونا، یہ ہمارے اپنے انتخاب کی بات ہے:

Sex is a matter of choice.

یہ قول موجودہ زمانے کے انسان کی ترجمانی کرتا ہے۔ موجودہ زمانے کے انسان کی یہ سوچ بن گئی ہے کہ تمام اخلاقی قدریں اضافی (relative) ہیں، نہ کہ حقیقی (real)۔ کسی نے اعلان کے ساتھ اور کسی نے اعلان کے بغیر یہ مان لیا ہے کہ نیکی اور بدی کا اصول کوئی ابدی اصول نہیں، نیکی اور بدی ہمارے اپنے انتخاب کی چیزیں ہیں:

Virtue and sin both are matter of personal choice, rather than a matter pertaining to good and bad.

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، خالق کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کا رول، انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہم تھا۔ وہ انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کی ایک داخلی ضمانت تھا۔ مارل سپورٹ سسٹم، خدا کے تخلیقی پلان کا ایک لازمی حصہ تھا، مگر انسان نے آزادی کے غلط استعمال کو اُس کی آخری حد تک پہنچا دیا۔

خدا نے انسان کی زندگی میں مارل سپورٹ سسٹم کی صورت میں چیک اینڈ بیلنس (check and balance) کا نظام قائم کیا تھا، تاکہ انسان، خدا کے مطلوب معیار کے منمم (minimum) پر قائم رہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں انسان اِس منمم حد پر قائم نہ رہ سکا۔ اِس طرح، اس نے یہ جواز (justification) کھو دیا کہ اس کو موجودہ زمین پر مزید مدت کے لیے باقی رکھا جائے۔

اخلاقی برائی کی آخری صورت

قومِ لوط کا زمانہ چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ قوم بحر مُردار (Dead Sea) کے علاقہ میں رہتی تھی۔ پیغمبر کے انذار کے باوجود وہ لوگ خدا کی پکڑ سے بے خوف ہوگئے۔ وہ بڑے پیمانے پر اُسی اخلاقی برائی میں مبتلا ہوگئے جس کو ہم جنسی (Homosexuality) کہا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں یہ برائی صرف ایک اخلاقی برائی کی حیثیت رکھتی تھی، مگر آج یہ اخلاقی برائی ایک خوب صورت فلسفہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ دنیا بھر میں تیزی سے اس کا رواج بڑھ رہا ہے، حتی کہ بعض ملکوں میں ہم جنسی کے نکاح کو ایک قانونی نکاح کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

نئی دہلی میں ہم جنس گروہ (gay community) بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اِس قسم کے تقریباً ایک ہزار افراد نے 29 جون 2008 کو دہلی کی سڑکوں پر اپنا ایک پُرفخر پریڈ (pride parade) نکالا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہم جنسی کو برا سمجھنا، یا اس کے خلاف قانون بنانا، یہ سوشل ڈس کری منیشن (social discrimination) ہے، اس کو بند ہونا چاہیے۔ یہ رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (30 جون، 2008) میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ چھپی ہے:

Gay pride out on capital's streets, p. 3.

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اِس مظاہرہ کے وقت لوگوں کی طرف سے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اِس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے شرم وحیا کو کھودیا ہے، اور سماج میں اخلاقی ضمیر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

یورپ اور امریکا اور کینڈا میں یہ موضوع کھلے ڈسکشن کا موضوع بن چکا ہے۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں اِس موضوع پر باقاعدہ رسرچ ہورہی ہے۔ رسرچ کرنے والے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جنسی کا رجحان خود نیچر کے اندر موجود ہے۔ اِس معاملے میں وہ بعض چڑیوں اور بعض کیڑوں (insects) کی مثال دیتے ہیں۔

اِن نام نہاد تحقیقات کے بارے میں کئی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا

نام یہاں درج کیا جاتا ہے:

Biological exuberance: Animal Homosexuality and Natural Diversity, by Bruce Bagemihl (Published in 1999)

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (29 جون، 2008) میں اِس کی رپورٹ تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

Homosexuality: Nature or Nurture

یہ صرف ایک مغالطہ ہے، نہ کہ کوئی حقیقی رسرچ۔ انسان کے بارے میں سائنٹفک رسرچ وہ ہے جو خود انسان پر کی گئی ہو اور انسان کے حیاتیاتی نظام کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہو۔ مذکورہ رسرچ میں یہ کیا گیا ہے کہ بعض کیڑوں کا مطالعہ کیا گیا اور اِن کیڑوں کی بعض عادات معلوم کرکے ان کو انسان کے اوپر چسپاں کردیا گیا۔ یہ ایک قیاس مع الفارق ہے، اور اِس قسم کا قیاس سائنسی طور پر معتبر نہیں۔

چار ہزار سال پہلے قومِ لوط ٹھیک اِسی عمل میں مبتلا ہوئی تھی۔ جب پیغمبرانہ اِنذار کے باوجود انھوں نے اپنی اس روش کو ترک نہیں کیا، تو اُن پر خدا کی طرف سے ہلاکت خیز عذاب بھیجا گیا۔ اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے اُس قوم کا خاتمہ ہوگیا۔ اب یہی عمل مزید اضافے کے ساتھ، ساری دنیا میں پھیل گیا ہے۔ قومِ لوط کا بگاڑ صرف اخلاقی بگاڑ کے ہم معنی تھا، موجودہ زمانے میں یہ اخلاقی بُرائی فلسفیانہ جواز کے تحت کی جارہی ہے۔ اِس طرح، موجودہ زمانے کی برائی، قدیم زمانے کی برائی کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ شنیع حیثیت رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ قدیم زمانے میں یہ برائی زمین کے صرف ایک محدود رقبے میں پائی جاتی تھی، آج یہ برائی پورے کرۂ ارض میں پھیل گئی ہے۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کو حدیث میں، قربِ قیامت کے آخری دور کی علامت کے طور پر، اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ویبقیٰ شرار الناس، یتهارجون فیها تهارُجَ الْحُمُر (صحیح مسلم، کتاب الفتن) یعنی اُس وقت صرف برے لوگ دنیا میں باقی رہیں گے جو گدھوں کی طرح بے حیائی کا فعل کریں گے۔

یہ صورتِ حال اپنے آپ میں اِس بات کا ایک اعلان ہے کہ خدا کی پکڑ کا وقت بالکل قریب

آچکا ہے۔قومِ لوط کے زمانے میں، خدا کا عذاب ایک محدود قیامت کے طور پر آیا تھا، جس کو قرآن میں عذابِ ادنیٰ (32:21) کہا گیا ہے۔ اب یہ عذاب عالمی قیامت کے طور پر آنے والا ہے، جس کو قرآن میں عذابِ اکبر (32:21) کہا گیا تھا۔قومِ لوط نے محدود طور پر اپنے وجود کا جواز (justification) کھو یا تھا، اب انسانیت نے عالمی سطح پر اپنے وجود کا جواز کھودیا ہے۔

حالات پکار رہے ہیں کہ کاؤنٹ ڈاؤن اب اپنی آخری گنتی تک پہنچ چکا۔ قیامت کا فرشتہ اب ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جاگنے والو، جاگو۔ دیکھنے والو، دیکھو۔ کان والو، سنو۔ دماغ والو، سوچو۔ آج کا دن تمھارے لیے آخری دن ہے۔ اگر آج تم اپنے اختیار سے ہوش میں نہ آئے تو کل تم کو مجبورانہ طور پر ہوش میں آنا پڑے گا۔مگر کل ہوش میں آنا، کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

موجودہ دنیا، انسان کو نہ انعام کے طور پر ملی ہے اور نہ کسی استحقاق کے طور پر۔ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے، اور خدا نے یہ دنیا انسان کو صرف ایک مقصد کے تحت عطا کی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں کے حالات میں رکھ کر یہ دیکھا جائے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو مطلوب خدائی معیار پر پورا اترا، تاکہ اس کا انتخاب (selection) کر کے اُس کو ابدی طور پر جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے اور باقی لوگوں کو رد کر کے ان کو عالمی کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے۔

آدم کی پیدائش کے بعد سے اب تک پورے سیارۂ زمین پر یہی عمل جاری رہا ہے۔ اِس دنیا میں انسان کی آبادکاری کا یہی واحد مقصد تھا، اِس کے سوا دوسرا کوئی مقصد نہیں جس کے لیے انسان کو اِس دنیا میں رہنے اور بسنے کا موقع دیا جائے۔

اب انسان کی تاریخ اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے، اور بظاہر حالات بتاتے ہیں کہ اب یہ مقصد آخری حد تک پورا ہو گیا ہے۔ اب انتخاب کا عمل اپنے نقطۂ انتہا (culmination) کو پہنچ چکا ہے۔ اب انتخاب کی اِس فہرست میں مزید کسی اضافے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

موجودہ زمانے میں جب فطرت کے خزانوں کا انکشاف ہوا، تو اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ

انسان اور بھی زیادہ اضافے کے ساتھ خدا کا اعتراف کرے، انسان اور زیادہ خدا پرست بن کر خدا کی انتخابی فہرست میں نمایاں جگہ پائے، مگر نتیجہ برعکس صورت میں نکلا۔ انسان سرکشی کے راستے پر چل پڑا۔ اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے کے بجائے، وہ اپنے لیے خود اِسی دنیا میں راحت اور عیش کا محل تعمیر کرنے میں مصروف ہوگیا۔

آج کی دنیا میں لوگوں کی سوچ کیا ہے، اُس کا اگر خلاصہ کیا جائے، تو وہ صرف ایک ہے — آج اور صرف آج (right here, right now) یعنی کل کو نظر انداز کرکے صرف آج میں جینا، اور آج کی دنیا میں خوشی اور راحت کی زندگی حاصل کرنا، کیوں کہ اس کے آگے کچھ اور نہیں۔ یہی آج کی دنیا میں ہر عورت اور مرد کا کلمہ ہے، خواہ اس نے لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہو، یا اس نے لفظوں میں اس کا اعلان نہ کیا ہو۔ اِس طرح، موجودہ زمانے میں پہلی بار مٹیریل ازم نے نظریاتی طور پر ایک مبرَّر میٹریل ازم (ideologically justified materialism) کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ بلاشبہہ بُرائی کا آخری درجہ ہے، اِس کے آگے برائی کا کوئی اور درجہ نہیں ہوسکتا۔

یہ صورتِ حال سرتاسر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے اب اِس کا حق کھودیا ہے کہ اُس کو موجودہ زمین پر مزید بسنے اور آباد رہنے کا موقع دیا جائے۔ مسیح کے الفاظ میں — کسان درانتی اٹھاتا ہے، کیوں کہ کاٹنے کا وقت آپہنچا۔

بیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں خدا کے اِس فیصلے کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، اور اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ایسے آثار ظاہر ہونے لگے جو یہ بتاتے تھے کہ اب انسان کے لیے بالکل آخری وقت آپہنچا ہے، اب اُس کو مزید مہلت ملنے والی نہیں۔

جون 2008 میں، جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، انسانی تاریخ کے خاتمہ کی یہ علامت ایک مسلّمہ سائنسی واقعہ کی حیثیت اختیار کرکے روزانہ کی ایک خبر بن چکی ہے۔ آپ ہر دن میڈیا میں اِس سے متعلق کوئی نہ کوئی خبر پاسکتے ہیں۔

یہاں اِس نوعیت کی ایک تازہ سائنسی خبر درج کی جاتی ہے۔ امریکا کے مشہور سائنسی ادارہ

ناسا(NASA) کے ممتاز سائنس داں جیمس ہانسین (James Hansen) نے بیس سال پہلے سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا تھا۔ اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا ہے۔

اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ بتایا ہے کہ — حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ دنیا کے لیے واحد امید یہ ہے کہ ذمے داروں کی طرف سے نہایت سخت قسم کے انقلابی اقدامات کیے جائیں۔ دنیا بہت پہلے، خطرے کی حد کو پار کر چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ مضر گیسوں کو 1988 کی حد پر دوبارہ واپس لے جایا جائے۔ زمین کی فضا میں انسانی ساخت کے کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اگر مزید بیس سال تک یہ جاری رہے، تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ انسان کا وجود ہی سرے سے مٹ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بالکل آخری موقع ہے:

NASA warming expert says this is the last chance

Washington: Exactly 20 years after warning America about global warming, a top NASA scientist said the situation has gotten so bad that the world's only hope is drastic action. James Hansen told Congress that the world has long passed the "dangerous level" for greenhouse gases in the atmosphere and needs to get back to 1988 levels. He said Earth's atmosphere can only stay this loaded with man-made carbon dioxide for a couple more decades without changes such as mass extinction, ecosystem collapse and dramatic sea level rises. "We're toast if we don't go on a very different path," Hansen, director of the Goddard Institute of Space Sciences who is sometimes called the godfather of global warming science said. "This is the last chance". Hansen brought global warming home to the public in June 1988 during a US heat wave. Hansen said that in five to 10 years, the Arctic will be free of sea ice in the summer. (The Times of India, New Delhi, June 25, p. 38)

موجودہ زمانے میں جس چیز کو گلوبل وارمنگ (global warming) کہا جاتا ہے، وہ دراصل

گلوبل وارننگ (global warning) ہے۔ یہ خالقِ کائنات کی طرف سے، اِس بات کا اعلان ہے کہ انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آپہنچا۔ جلد سے جلد جنت کی خدائی فہرست میں اپنا نام درج کرادو، کیوں کہ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ اِس کا موقع آخری طور پر ختم ہوجائے گا۔

حالات بتاتے ہیں کہ انسان موجودہ زمین پر اب اپنی مزید آبادکاری کا جواز (justification) کھوچکا ہے۔ اب خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، بہت جلد انسانی تاریخ کا اگلا دور شروع ہونے والا ہے، جب کہ منتخب لوگوں کو ابدی جنت میں بسادیا جائے، اور بقیہ لوگوں کو رد (reject) کرکے اُنھیں حسرت کے صحرا میں ابدی طور پر ذلت اور محرومی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ کا فارمولا عام طور پر، قبل ازموت زندگی (pre-death period of life) کی تعمیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ''رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ'' کا فارمولا بعد ازموت زندگی (post-death period of life) کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے، یعنی ''رائٹ ہیر، رائٹ ناؤ'' کا مطلب مستقبل کی تیاری ہونا چاہیے، نہ کہ حال کا وقتی انجوائے مینٹ۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اب انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آچکا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور اپنے باقی ماندہ وقت کو اگلے مرحلۂ حیات (post-death period) کی تیاری میں لگادے۔ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ انسان کے پاس نہ کچھ کرنے کا وقت ہوگا اور نہ تلافیٔ مافات کے لیے پیچھے لوٹنے کا وقت۔

تاریخِ انسانی کا خاتمہ

12 اگست 2012 کو امریکا کی ایک خبر تمام اخباروں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ وہ خبر یہ تھی کہ ایک امریکی صحافی کو نظریاتی سرقہ (plagiarism) کا مرتکب پایا گیا اور اِس بنا پر اس کو اس کے صحافتی جاب سے فوری طور پر معطل کر دیا گیا۔ اس خبر کی سرخی یہ تھی:

American journalist suspended for plagiarism.

نظریاتی سرقہ (plagiarism) کیا ہے، وہ دراصل کسی شخص کی فکری پراپرٹی (intellectual property) کا سرقہ کرنے کا نام ہے۔ نظریاتی سرقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے آئڈیا کو اصل مصنف کے حوالے کے بغیر اپنا بنا کر نقل کیا جائے:

Plagiarism: Copying someone's idea without crediting the original author. *(Merriam-Webster Dictionary)*

یہ معاملہ امریکا کے مشہور صحافی مسٹر فرید زکریا کا ہے۔ وہ امریکی میگزین ٹائم (Time) کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ٹائم کے شمارہ 20 اگست 2012 میں اپنا ایک مضمون گن کلچر کے موضوع پر شائع کیا۔ اِس کا عنوان یہ تھا: The Case for Gun Control

اِس مضمون میں انھوں نے ایک پیراگراف شامل کیا تھا جو پورا کا پورا، ایک اور شائع شدہ مضمون سے لیا گیا تھا۔ یہ دوسرا مضمون امریکا کی ایل (Yale) یونی ورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر جل لیپور (Jill Lepore) کا تھا، جس کو مسٹر فرید زکریا نے بلا حوالہ اپنے مضمون میں شامل کر لیا تھا۔ یہ مضمون امریکا کے ایک اخبار نیو یارکر *(The New Yorker)* کے شمارہ 22 اپریل 2012 میں اس عنوان کے تحت چھپا تھا— Battleground America

نظریاتی سرقہ کا یہ واقعہ جو عالمی میڈیا میں آیا ہے، وہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ دراصل اِس قسم کے ایک زیادہ بڑے سرقہ (super plagiarism) کے لیے ایک یاددہانی (reminder) کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک انسان کی برخاستگی کے حوالے سے یہ یاد دلا رہا ہے کہ شاید وہ وقت

آ گیا ہے جب کہ کائنات کا مالک پوری تہذیب کو برخاست کر دے۔

سترھویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا میں روایتی دور قائم تھا۔اس کے بعد دنیا میں سائنٹفک دور کا آغاز ہوا۔سائنٹفک دور سے مراد وہ دور ہے جب کہ انسان نے نیچر (nature) پر آزادانہ غور وفکر شروع کیا۔ اِس غور وفکر کے بعد یہ ہوا کہ نیچر میں چھپے قوانین ایک کے بعد ایک دریافت ہونے لگے۔ مثلاً پانی میں اسٹیم پاور کی دریافت، اور مادّہ (matter) میں بجلی (electricity) کی دریافت، وغیرہ۔جدید دنیا، خاص طور پر مغربی دنیا میں کئی سو سال تک اِس موضوع پر رسرچ جاری رہی، یہاں تک کہ فطرت میں چھپے ہوئے ہزاروں قوانین دریافت ہو گئے۔اِن کے ذریعے ایک نئی ٹکنالوجی بنی اور بہت سے نئے فنی علوم وجود میں آئے۔وہ ظاہرہ جس کو جدید مغربی تہذیب کہا جاتا ہے، اس کی تشکیل تمام تر انھیں دریافت کردہ قوانین فطرت پر مبنی ہے۔

یہ قوانین جو موجودہ زمانے میں معمارانِ تہذیب نے دریافت کیے، اُن کو سائنسی قوانین (scientific laws) کہا جاتا ہے۔مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ سائنسی قوانین نہیں ہیں، بلکہ وہ خدائی قوانین (divine laws) ہیں۔خدائی قوانین کو نظامِ فطرت سے لینا اور اُن کو سائنس قوانین کے نام پر اپنا بنا کر پیش کرنا، یہ بلاشبہہ ایک سپر سرقہ (super plagiarism) کا کیس ہے۔ تہذیب جدید کے معماروں کا یہ واقعہ بھی بلاشبہہ اِسی قسم کا ایک سرقہ ہے۔امریکی صحافی کا سرقہ اگر جرنلسٹک سرقہ (journalistic plagiarism) تھا تو معمارانِ تہذیب کا سرقہ سائنٹفک سرقہ (scientific plagiarism) ہے۔امریکی صحافی نے تو صرف اپنے ایک آرٹکل میں نظریاتی سرقہ کا ارتکاب کیا تھا، جب کہ مغربی تہذیب کا پورا کا پورا ڈیولپمنٹ اِسی قسم کے عظیم تر نظریاتی سرقہ کی بنا پر ہوا ہے۔ امریکی جرنلسٹ کا سرقہ اگر صرف ایک انفرادی سرقہ تھا تو مغربی تہذیب کا سرقہ اس کے مقابلے میں ایک عالمی سرقہ (global plagiarism) کی حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا سے انسان کے بے دخلی

تہذیب کی ترقی کے نام پر مذکورہ سائنسی سرقہ کئی سو سال سے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں

جاری ہے، مگر اِس مدت میں اہلِ تہذیب کے درمیان کوئی شخص نہیں اٹھا جو یہ اعلان کرے کہ یہ تمام تہذیبی ترقیاں خدائی قوانین (divine laws) کی بنا پر ممکن ہوئی ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم کھلے طور پر اِس حقیقت کا اعتراف کرلیں ۔ بے اعترافی کا یہ معاملہ اب اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے، جب کہ کائنات کا خالق انسان کو زمین کے چارج سے بے دخل کردے اور زمین کا اور پوری دنیا کا نظام حقیقتِ واقعہ کی بنیاد پر قائم کرے۔

دنیا کا یہ انجام پیشگی طور پر مقدر تھا۔ خدا نے پیشگی طور پر یہ اعلان کردیا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب کہ انسان کو زمین کے چارج سے بے دخل کردیا جائے اور دنیا کا نیا نظام بنایا جائے۔ اِس سلسلے میں قرآن کا ایک بیان یہ ہے: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (39:67)۔

اِس آیت میں 'قدر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قدر کا مطلب ہے اندازہ کرنا، یعنی انسان جو کچھ دنیا میں کررہا ہے، وہ اِس لیے کررہا ہے کہ اس نے خالق کا کم تر اندازہ (under-estimation) کررکھا ہے۔ یہ کم تر اندازہ کیا ہے، اِس کم تر اندازہ کو قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (23:115) یعنی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔

اس سلسلے میں حدیث کی کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ یہ روایت قرآن کی مذکورہ آیت (وما قدروا اللہ حق قدرہ) کی مزید تشریح کرتی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرأ هذه الآية ذات يوم على المنبر "وما قدروا الله حق قدره، والأرض جميعاً قبضته يوم القيامة والسماوات مطويات بيمينه، سبحانه وتعالى عما يشركون" ورسول الله صلى الله عليه وسلم يقول هكذا بيده ويحركها يقبل بها أو يدبر يمجد الرب نعته: أنا الجبار، أنا المتكبر، أنا الملك، أنا العزيز، أنا الكريم، فرجف برسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر حتى قلنا ليخرن به (السلسلة الصحيحة، 7/596) یعنی عبد اللہ بن عمر بیان

کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ممبر کے اوپر قرآن کی مذکورہ آیت پڑھی۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا کہ اللہ اپنی تمجید کرے گا اور کہے گا کہ میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں زبردست، میں ہوں کریم۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، کہاں ہیں جبار، کہاں ہیں متکبر۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لرزہ طاری ہوا، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ شاید آپ گر پڑیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب کہ خالقِ کائنات ظاہر ہو اور براہِ راست طور پر دنیا کا چارج لے لے۔ اسباب کے اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ قرآن میں جس آنے والے وقت کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ وقت بالفعل آچکا ہے، اُس وقت کے آنے میں اب کوئی دیر نہیں۔

لائف سپورٹ سسٹم کی تباہی

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انسان کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً پانی، روشنی، آکسیجن، نباتات، وغیرہ۔ اِن چیزوں کے مجموعے کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے، یعنی معاونِ حیات نظام۔ سائنس کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین پر یہ معاونِ حیات نظام خطرناک حد تک بگڑ گیا ہے، سائنس داں برابر یہ انتباہ دے رہے ہیں کہ زمین پر انسان کی آبادکاری بہت جلد ناممکن ہو جائے گی، یہاں تک کہ مشہور برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ نے اِس صورت حال کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم کو اب خلائی بستیاں (space colonies) بنانا چاہیے، حالاں کہ اسٹفن ہاکنگ اور دوسرے تمام لوگ جانتے ہیں کہ یہ تجویز عملاً ممکن نہیں۔

زمین کا وہ حصہ جس کو آرکٹک (Arctic) کہا جاتا ہے، یہ برف کے بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہے جو کئی ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ زمین پر موسم کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ آرکٹک (قطب شمالی) کا یہ منطقہ مختلف پہلوؤں سے زمین پر انسان کی آبادی کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں، جب سے گلوبل وارمنگ کے ظاہرے نے شدت اختیار کی ہے، قطب شمالی کی یہ برف بہت تیزی سے پگھل رہی ہے۔

سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق، شاید اندیشہ ہے کہ اگلے 10 برسوں میں یہ پورا برفانی پہاڑ پگھل کر سمندروں میں چلا جائے۔ اِس کی بنا پر مختلف قسم کے خطرناک نتائج پیدا ہوں گے جو زمین کو انسان کے لیے ناقابلِ رہائش بنا دیں گے۔اس سائنسی تحقیق کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (14 اگست 2012) میں حسب ذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ہے:

Arctic Sea Ice May Vanish in 10 Years (p. 19)

خلاصہ کلام

اوپر جو کچھ لکھا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نے اُس نوعیت کا ایک بہت بڑا واقعہ کیا ہے جس کو نظریاتی سرقہ کہا جاتا ہے۔ وہ چیز جس کو جدید تہذیب کہا جاتا ہے، وہ پوری کی پوری اِسی جرم کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔اِس جرم میں موجودہ زمانے کی پوری آبادی شریک ہے۔جن لوگوں نے اِس تہذیب کو وجود دیا، وہ اِس جرم میں براہِ راست طور پر شریک ہیں، اور بقیہ لوگ جو تہذیب کے اِس جرم پر نکیر (denial) کیے بغیر اُس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ بالواسطہ طور پر اِس جرم میں شریک ہیں۔

اِس نظریاتی سرقہ (plagiarism) کے خلاف خالق کی کارروائی اب مستقبل بعید کی چیز نہیں رہی۔ یہ کارروائی اب عملاً شروع ہو چکی ہے۔ اِس کارروائی کو ایک لفظ میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خالق نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان کو مذکورہ جرم کی بنا پر زمین سے بے دخل کر دیا جائے۔ خالق کا یہ فیصلہ لائف سپورٹ سسٹم کے خاتمے کی صورت میں بتدریج ظاہر ہو رہا ہے۔ بظاہر وہ وقت بہت قریب آچکا ہے جس کی پیشین گوئی قرآن کی مختلف آیتوں میں کی جا چکی تھی۔

اظہارِ دین

عصری اسلوب میں اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ

دورِ حاضر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دورِ اسلام ہے۔ دورِ حاضر کی علمی ترقیوں نے اسلام کی عالمی اہمیت کو ازسرِ نو واضح کیا ہے۔ سائنس اسلام کا علمِ کلام ہے۔ دورِ جدید کو ایک آئڈیالوجی کی ضرورت ہے۔ اسلام اِسی آئڈیالوجی کا دوسرا نام ہے۔ روحِ عصر سب سے زیادہ جس چیز کی طالب ہے، وہ بلاشبہہ دینِ اسلام ہے۔ اسلام اپنے نظریے کے اعتبار سے، مبنی بر توحید دین ہے اور اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے، مبنی بر امن دین— عصری اسلوب میں اسلام کے اِن تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے 'اظہارِ دین' کا مطالعہ کیجئے۔